اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

مرزا قلیچ بیگ: شخصیت اور فن

نصیر مرزا

پاکستانی ادب کے معمار

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار
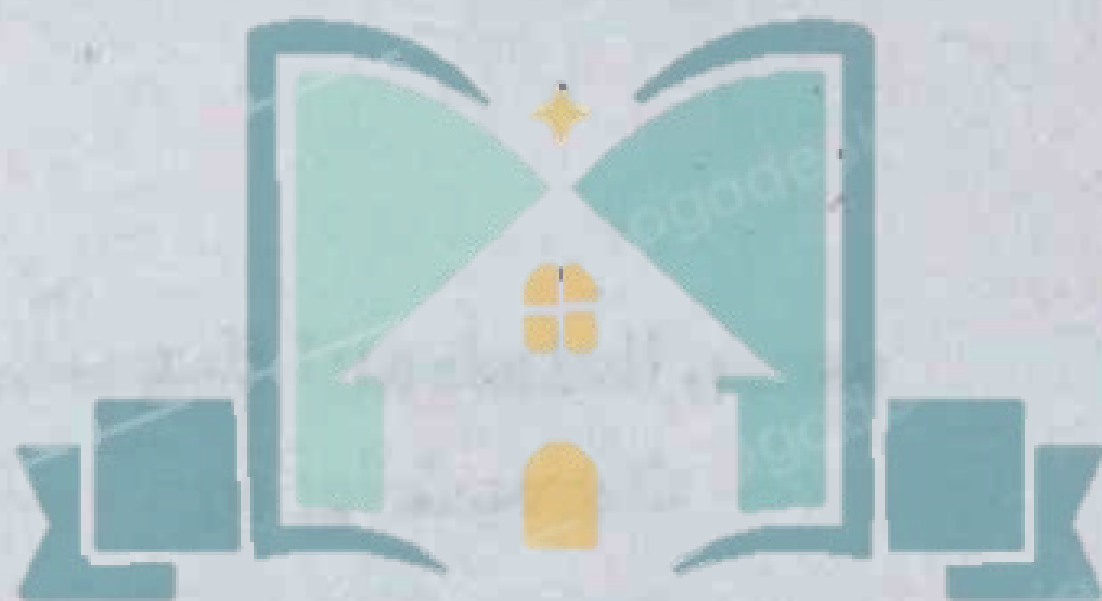
شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ
شخصیت اور فن

نصیر مرزا

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ : افتخار عارف
منتظم : محمد انور خان
تدوین وطباعت : سعیدہ درانی
سکیچ : احمد حبیب
اشاعت : 2006ء
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت : مجلد: -/115 روپے
پیپر بیک: -/110 روپے

ISBN:969-472-192-X

فہرست

پیش نامہ	افتخار عارف	7
پیش لفظ	نصیر مرزا	9
آباؤ اجداد		13
پیدائش		13
زمانۂ قلیچ		16
قلیچ بیگ کے شب و روز		19
غمِ روزگار		23
احساسِ جمال کی کارفرمائیاں		23
قلیچ بیگ کی ہیئت مجموعی		24
لباس و آواز		25
قلیچ اور کھیل کود		26
قلیچ وسیع المشرب ادیب و عالم		27
خانوادۂ قلیچ کی ادبی خدمات		28
اولادیں		30
قلیچ اور بمبئی		30
معاصرِ قلیچ		32
مہد تا لحد، دلچسپ واقعات (بقلم خود)		33

نگران اعلیٰ : افتخار عارف
منتظم : محمد انور خان
تدوین وطباعت : سعیدہ درانی
سکیچ : احمد حبیب
اشاعت : 2006ء
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت : مجلد: -/115 روپے
پیپر بیک: -/110 روپے

ISBN:969-472-192-X

فہرست

پیش نامہ	افتخار عارف	7
پیش لفظ	نصیر مرزا	9
آباؤ اجداد		13
پیدائش		13
زمانۂ قلیچ		16
قلیچ بیگ کے شب و روز		19
غمِ روزگار		23
احساسِ جمال کی کارفرمائیاں		23
قلیچ بیگ کی ہیئت مجموعی		24
لباس و آواز		25
قلیچ اور کھیل کود		26
قلیچ وسیع المشرب ادیب و عالم		27
خانوادۂ قلیچ کی ادبی خدمات		28
اولادیں		30
قلیچ اور بمبئی		30
معاصرِ قلیچ		32
مہد تا لحد، دلچسپ واقعات (بقلم خود)		33

حیاتِ قلیچ (سال بہ سال)	41
قلیچ بیگ کا اسلوبِ نثر	44
قلیچ بیگ اور افسانوی ادب	54
قلیچ بیگ اور بچوں کا ادب	55
قلیچ بیگ، بحیثیت شاعر	61
قلیچ بیگ، ایک رجحان ساز شاعر	64
نمونۂ کلام	79
چند علمی و ادبی کارناموں کے مختصر جائزے	104
مقالاتِ الحکمت	106
لطیف شناسی	107
قلیچ اور تاریخ سندھ	109
سانو بن یا کارو بنو (خودنوشت)	112
مرتبہ قلیچ بخراجِ تحسین	113
آوازِ دوست	117
کتابیاتِ قلیچ	125
حرفِ آخر	132

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990ء میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

مرزا قلیچ بیگ صحیح معنی میں ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخص تھے۔ جدید سندھی ادب کا شاید ہی ایسا کوئی شعبہ ہو جس میں مرزا قلیچ بیگ کے ان مٹ نقوش موجود نہ ہوں۔ وہ انتہائی خوش فکر شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ فن تحقیق اور تدوین میں بھی وہ درجہ کمال پر فائز تھے۔ انگریزی، فارسی، عربی اور اردو سے بے مثال تراجم کے ذریعے انھوں نے جدید سندھی ادب کے خزانے کو نہایت ثروت مند بنا دیا ہے۔ مسلمانانِ سندھ میں قلیچ بیگ ایسی پہلی بڑی شخصیت تھے جنہیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

پیش نظر کتاب "شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ: شخصیت اور فن" ملک کے معروف ادیب مرزا نصیر مرزا نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

پاک و ہند کی دنیائے ادب میں شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کی زندگی، شخصیت اور ادبی کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے، جس کے لیے میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین اور پاک و ہند کے معروف شاعر جناب افتخار عارف اور ''پاکستانی ادب کے معمار'' اشاعتی منصوبے کی نگراں محترمہ سعیدہ درانی صاحبہ کا ازحد مشکور ہوں۔

خانوادۂ قلیچ سے وابستگی کے باعث میں نے یہ کتاب کتب خانۂ قلیچ ٹنڈو ٹھوڑو حیدرآباد میں بیٹھ کر خود آپ کی ذاتی لکھی ہوئی اور آپ پر لکھی ہوئی کتابوں کی روشنی میں تیار کی ہے۔ علاوہ ازیں مرزا صاحب سے متعلق رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے ان گنت مضامین و مقالے مجھے دستیاب ہوئے، ان سب ماخذات سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ماخذ میرے لیے قلیچ بیگ کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جو ''سائو پن یا کارو پنو'' کے نام سے 1965ء میں سندھی ادبی بورڈ جامشورو کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔

کتاب کی تیاری میں مجھے جن عزیز و اقارب اور دوست احباب کا تعاون حاصل ہوا، میں ان سب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بے شک ان لوگوں کی عملی اعانت کے بغیر اس مشکل مرحلے کا طے ہونا قطعی ممکن نہ تھا۔

نصیر مرزا

حالات زندگی

مرزا قلیچ بیگ بطور ادیب، حیرت انگیز حد تک مرتب اور منظم زندگی گزار کر چھہتر (76) برس کی عمر میں دار الفنا سے دار البقا روانہ ہوئے اور اپنے جنم شہر حیدر آباد سندھ کے معروف بلند شاہ نامی آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ انہوں نے اپنی لحد زندگی ہی میں تیار کروا رکھی تھی اور یوں مزار کے لیے میر انیس کی مندرجہ ذیل مشہور رباعی کا سندھی زبان میں ترجمہ بھی کر رکھا تھا۔

مر مر کے میں نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

قلیچ بیگ کے آباؤ اجداد وسط ترکستان سے، سندھ میں تشریف لائے تھے، خود قلیچ بھی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کا مطلب ہے ''تلوار'' اور یہ تلوار انیسویں صدی کے اواخر میں میدانِ ادب سے کیا نمودار ہوئی کہ اس کی آب و تاب سے تمام سندھی ادب جگمگانے لگا تھا۔

مرزا قلیچ بیگ جو سندھی زبان کے پُر نویس مصنف اور پُر گو شاعر مانے جاتے ہیں۔ صوبہ سندھ کے سب سے بڑے تہذیبی مرکز اور سب سے خوشحال شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور خوش قسمتی کہ ایام جوانی ہی میں آپ نہ فقط اپنے شہر حیدر آباد میں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شہریوں اور مقبول مصنفوں میں شمار ہونے لگے تھے۔

راقم الحروف کے لیے یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ قلیچ بیگ، والد مرحوم ناصر علی بیگ مرزا کے سگے ماموں تھے، اور اب اس سے بڑی خوش بختی میرے لیے کیا ہوگی کہ خانوادۂ قلیچ میں، آپ کی ولادت کے ٹھیک ایک سو سال بعد، آپ کی گلی کے آخری مکان میں، میں نے آنکھ کھولی، میں کہیں بھی جاؤں، کہیں سے بھی آؤں شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کا گھر صبح و شام میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ خاندانِ عزیز کے وہ تمام بزرگ خواتین و حضرات جنہوں نے قلیچ بیگ سے بالمشافہ

ملاقات کی یا زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آپ کی زیارت و گفتگو سے فیض یاب ہوئے، ایسی شخصیات میں اب کوئی بھی بقیدِ حیات نہیں۔ البتہ قلیچ بیگ کی رہائش گاہ وہ واحد جگہ ہے، جو اب بھی صحیح و سالم حالت میں موجود ہے، اور بار ہا اس گھر کے درو دیوار، دیواروں پر آویزاں ان کی تصاویر، ان کے سونے اور آرام کرنے کا پلنگ، لکھنے پڑھنے اور بیٹھنے کے ٹیبل، کرسیاں، ان کے کپڑے، کوٹ، بوٹ، ٹائیاں، سب ہی کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور ان کے ملاحظے سے یہ جانا ہے کہ قلیچ بیگ اگرچہ مشرقی سوچ اور ذہن کے مالک تھے، مگر ان کی بود و باش پر مغربی طرزِ زندگی کا رنگ اور اثر غالب نظر آتا ہے۔

1910ء میں، ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی رہائش گاہ سے قریب، اپنے باغ میں املتاس کے درخت پر ایک مچان بنوایا، جسے وہ اپنا گھونسلہ کہتے تھے۔ اسی گھونسلے میں پہروں جا کر بیٹھتے اور وہاں غور و خوض اور لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ قریباً ایک صدی گزرنے کے بعد اب ٹنڈو ٹھوڑو میں نہ وہ باغ باقی رہا ہے اور نہ ہی املتاس کا وہ درخت کہ جس پر قلیچ بیگ نے یہ گھونسلہ تعمیر کروایا تھا۔ گویا:

زمیں کھا گئی ، آسماں کیسے کیسے

قلیچ بیگ کو دنیا میں ہونے والی نت نئی سائنسی ایجادات، ساز و سامان اور اشیاء سے بھی گہری دلچسپی رہی تھی۔ 72-1871ء میں آپ نے فوٹو گرافی کا فن سیکھا اور خود اپنا کیمرہ خرید کر خاندان کے بزرگوں اور نوجوانوں، خواتین و حضرات کی تصویریں بنائیں اور خود ڈیولپ کیں۔ گذشتہ صدی کی پہلی دہائی کے شروع برسوں میں آوازیں ریکارڈ کرنے کی مشین برطانیہ سے منگوائی اور اپنی پہلی بیوی خیر النساء (وفات 1904ء) کی آواز اور خود اپنی آواز میں تلاوتِ کلام پاک اور نعتیہ کلام ریکارڈ کیا، اگرچہ نوادراتِ قلیچ میں اب یہ ریکارڈنگ موجود نہیں ہے، مگر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو غالباً برصغیر میں یہ اس قسم کی پہلی ریکارڈنگ شمار ہوگی۔

ایامِ آخر میں اگرچہ مرزا صاحب نے گوشہ نشینی کو ترجیح دی تھی، مگر اس کے باوجود علم و ادب کی جانب ان کی کمٹمنٹ Commitment بالکل واضح تھی۔ زندگی، مذہب اور موت جیسے بنیادی موضوعات کے بارے میں وہ قطعی کسی ذہنی الجھن اور Confusion کا شکار نہ تھے۔

قلیچ انگریز دورِ حکومت میں پیدا ہوئے تھے۔ چاہتے تو انگریزی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے، مگر انھوں نے اپنی مادری زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کیا، اور خاص کر سندھی زبان میں متعدد اصناف کے موجد کہلائے۔

قلیچ اپنی ذات و صفات میں ایک بے طمع ادیب و شاعر تھے، اپنی تصنیف کردہ کسی کتاب کا کبھی کسی پبلشر سے معاوضہ وصول نہ کیا۔ اور اپنے تمام مسودے پبلشرز حضرات کو بلا معاوضہ فراہم کیے۔ خلافِ طبع بات ہونے پر قلیچ بیگ کبھی طیش میں نہ آتے تھے، غصے کا اظہار مقصود ہوتا تو بس زیرِ لب لفظ ''نالائق''

یا ''بدمعاش'' کہہ دیتے، کبھی اونچی آواز میں گفتگو نہ کی۔ ظاہر ہے یہ باتیں قلیچ بیگ کے فرشتہ صفت انسان ہونے کی دلیل ہیں۔ گویا میر تقی میر کی زبان میں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

پیرانہ سالی، اور پے در پے بھائیوں، بہنوں، عزیزوں، دوستوں اور ہمعصر احباب کے گزر جانے کے باوجود قلیچ بیگ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کبھی ماند نہ پڑنے دیا اور مسلسل تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے۔ دراصل کام ان کی فطرت کا سب سے اہم عنصر بن چکا تھا۔

اپنی زندگی کی آخری کتاب جس پر وصال سے چند دن پہلے تک کام کر رہے تھے، شہزادی زیب النساء سے متعلق تھی، افسوس وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے۔

3 جولائی 1929ء کو آپ کا وصال ہوا اور یوں یہ دن محض ایک نابغہ روزگار شخص کے وصال کا دن نہ تھا بلکہ بہار آفریں پورے ادبی دور کے اچانک اجڑ جانے کا دن بھی تھا۔ یہ سانحہ صرف ان کے خاندان یا حیدرآباد کے شہریوں کے لیے قیامت خیز نہ تھا بلکہ پاک و ہند کے تمام ادبی حلقوں کے لیے بھی صدمۂ جاں سے کم نہ تھا۔

قلیچ بیگ کو اپنے زمانے میں ملٹی ڈائمینشنل شخصیت کے طور پر جانا گیا، اور ہم عصروں میں آپ دُرِ یکتا کہلائے۔ ایسی مرقع صفات، ہمہ گیر و ہفت پہلو شخصیت کے متعلق زیرِ نگاہ کتاب، محض ایک مختصر تعارف ہی تصور کی جاسکتی ہے کہ کسی بحرِ ذخار کو کسی کوزہ میں کب سمیٹا جا سکا ہے۔

یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ سندھی زبان میں آپ کی ذات وصفات اور علمی وادبی کارناموں سے متعلق جرائد و رسائل میں اب تک سینکڑوں مضامین، مقالے شائع ہو چکے ہیں اور متعدد ادبی اداروں کی جانب سے ''قلیچ نمبر'' بھی مرتب کیے جا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی ادبی حیثیت و شخصیت پر محترمہ نعیمہ تیجانی کا مقالہ اور ڈاکٹر مرزا حبیب اللہ رحیم بخش کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس بعنوان ''شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ بہ حیثیت نثر نویس'' بھی لکھے جا چکے ہیں۔ مگر افسوس یہ دونوں ضخیم مقالے اب تک زیورِ اشاعت سے آراستہ نہ ہو پائے ہیں۔

آباو اجداد اور پیدائش

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے آباؤ اجداد 1805ء میں روس کے شہر جارجیا گرجستان سے ہجرت کر کے حیدرآباد سندھ آئے تھے، سندھ میں اس وقت تالپور بادشاہ میر غلام علی خان کی بادشاہت تھی۔

سب سے پہلے، مرزا قلیچ بیگ کے نانا مرزا خسرو بیگ، تالپور حکمرانوں کے دربار میں پہنچے، بعد میں مرزا صاحب کے والد مرزا فریدون بیگ کی سندھ میں آمد ہوئی۔

''آپ کے آباؤ اجداد جارجیا گرجستان کے امراء اور مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا فریدون بیگ کی شادی مرزا خسرو بیگ کی دختر سکینہ بیگم سے انجام پائی۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ کے یہاں سات بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ مرزا قلیچ بیگ اپنے ان بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے اور آپ کی ولادت چار محرم الحرام 1270ء بمطابق 17 اکتوبر 1853ء پر ٹنڈو ٹھوڑو حیدر آباد سندھ میں ہوئی۔ ولادت کے ماہ وسال کی مناسبت سے آپ نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔''

میں محرم میں ہوا پیدا، تھی جب تاریخ چار
نالہ و شیون بپا تھا، گریہ و آزار بھی

لکھنے پڑھنے کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا جسے انہوں نے آخری سانسوں تک جاری رکھا۔ مشکل سے آٹھ نو برس کے ہوں گے کہ آپ نے مشقِ سخن کا آغاز کیا اور ننھے منے ذہن سے اختراع کی ہوئی تخلیقات اپنے والد گرامی اور نانا بزرگوار کی خدمت میں لے جاتے اور انہیں پڑھ کر سناتے، بقول مرزا صاحب ان کے نانا محترم حضور مرزا خسرو بیگ ان تخلیقات کو پڑھ کر بہت خوش ہوتے اور داد کے طور پر خشک میوہ جات سے انہیں نوازتے اور مزید کچھ لکھ کر لانے کے تقاضے کرتے تھے۔

یوں رفتارِ عمر کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن میں پختگی آتی چلی گئی اور اب آپ سندھی زبان کے علاوہ اردو فارسی میں بھی شعر کہنے لگے تھے جن پر اپنے والد فریدون بیگ سے اصلاح لیتے تھے، بقول آپ کے:

''میں نے سندھی، فارسی، ہندی میں جو کچھ بھی اوائل عمر میں کہا ہے اس پر صرف والد بزرگوار فریدون بیگ ہی سے اصلاح لی ہے۔''

یہ آپ کا ذوقِ سلیم ہی تھا جو آپ کی راہنمائی کرتا رہا اور نظم ہو کہ نثر، دن بہ دن ان کی تحریر میں استادانہ پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔

آپ کے والد مرزا فریدون بیگ چوں کہ خود فارسی کے ایک زبردست عالم، شاعر اور صاحب علم وفضل تھے، لہٰذا اپنی اولاد کو بھی اپنے نقشِ قدم پر چلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مرزا قلیچ بیگ ایسے ہی عالم فاضل والد گرامی کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ اگرچہ مرزا صاحب فنِ شاعری سے اوائل عمر ہی سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اور مشقِ سخن کے دوران والد بزرگوار سے راہنمائی پا رہے تھے۔ مگر غیر معمولی تخلیقی جوہر چوں کہ پیدائشی طور پر آپ میں موجود تھا، جو جوانی کے نصف النہار تک آتے آتے

سندھی آسمان ادب کے کنارے پر بے مثل آفتاب چمکنے لگا تھا۔ 23، 24 برس کی عمر ہی میں انہیں شہرت دوام حاصل ہوگئی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ اوائل عمری کے اسی دور میں انہوں نے انگریزی زبان میں لکھے گئے فلسفیانہ اور پیچیدہ مضامین کے مجموعہ "لارڈ بیکن کی کتاب کا ترجمہ" مقالات الحکمت" کے نام سے سندھی زبان میں پیش کیا جس کے شائع ہوتے ہی ان کا نام سندھ کے علمی وادبی حلقوں میں نہایت توقیر و تعظیم کے ساتھ لیا جانے لگا تھا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

مرزا قلیچ بیگ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ٹنڈو ٹھوڑو کے ایک خانگی مکتب میں آخوند شفیع محمد سے حاصل کی۔ بعد میں آپ کو حیدر آباد شہر کے ایک اسکول میں داخل کیا گیا۔ جہاں آپ کے پہلے استاد گرامی کا نام تھا استاد آخوند ولی محمد بعد میں اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر قاضی حاجی احمد (ٹمیاری والے) آپ کے استاد مقرر ہوئے۔ گلستان، بوستان، انوار سہیلی، سکندر نامہ اور دیگر فارسی کتب، ان ہی سے پڑھی تھیں۔ بلکہ عربی زبان کی تحصیل بھی استاد محترم قاضی حاجی احمد سے ہی حاصل کی تھی۔

بقول قلیچ بیگ کے "خانگی مکتب تا آخوند، قاضی یا اسکول میں ماسٹر صاحب کے پاس پڑھتے ہوئے۔ کسی استاد نے مجھے کبھی نہیں مارا۔ بچپن ہی سے والدین اور تمام اساتذہ نے پنج وقتہ نماز کی تاکید کی۔ لہٰذا نماز روزے کی عادت جو بچپن سے تھی اب تک چلی آتی ہے۔"

مزید تعلیم کے لیے قلیچ بیگ کو اینگلو ورنیکولر اسکول حیدر آباد میں داخلہ دلایا گیا۔ جہاں ہر امتحان میں بقول آپ کے "میں اول آتا تھا" بعد میں قلیچ بیگ کو ان کے بڑے بھائی مرزا صادق علی بیگ کی طرح ایلفنسٹن کالج بمبئی میں داخلہ دلایا گیا۔ اور یہ سال تھا 1872ء۔ اس کالج سے قلیچ بیگ کے بھائی مرزا صادق علی بیگ نے، کہ جو پہلے سندھی مسلمان تھے۔ بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

مرزا قلیچ، جس وقت ایلفنسٹن کالج بمبئی میں پڑھتے تھے۔ کالج کے پرنسپل تھے پروفیسر ورڈ سورتھ اور ان کے فارسی کے ٹیچر تھے پروفیسر مرزا حیرت۔ قلیچ بیگ کو غیر معمولی ذہانت کے باعث، بہت جلد مرزا حیرت نہ فقط اپنے پسندیدہ شاگردوں کے حلقے میں شمار کرنے لگے تھے۔ بلکہ بقول قلیچ:

"مجھے اپنا حقیقی بیٹا تصور کرنے لگے۔ اور پرشن پر میری دسترس کے باعث، امتحانی پرچوں میں، آپ مجھے ہمیشہ سو میں سے سو نمبر دیتے۔"

قلیچ بیگ نے علم عروض اپنے اسی استاد سے سیکھا۔ مرزا حیرت کے تعلقات کی بناء پر قلیچ بیگ کا بمبئی میں، آغا خان اول کے یہاں آنا جانا ہوا اور آغا خان کے چھوٹے صاحبزادے اکبر شاہ سے آپ کی دوستی

ہوگئی۔ پرشین پر غیر معمولی دسترس کے باعث، قلیچ بیگ کو دوران تعلیم اس کالج میں فیلو مقرر کیا گیا اور وہ چھوٹی اور کبھی کبھی بڑی کلاسوں میں بھی پرشین پڑھانے لگے۔ بمبئی ہی میں قیام و تعلیم کے دوران میں 1872ء میں اچانک قلیچ بیگ کی والدہ محترمہ سکینہ بیگم کا انتقال ہوگیا، جس کا آپ کو شدید صدمہ ہوا۔ پڑھنے سے آپ کا جی اُچاٹ ہوگیا اور اس صدمے کے باعث نتیجہ یہ نکلا کہ قلیچ بیگ بی۔اے کے امتحان میں پاس ہو نہ سکے۔ ان صدمات کے باعث ان کی صحت بھی خراب ہوتی گئی۔ اور وہ بالآخر تعلیم ادھوری چھوڑ کر سندھ واپس آگئے۔

قلیچ بیگ نے کراچی میں مسٹر مجی، ایک ماہر فن سے فوٹو گرافی کا ہنر سیکھا اور اپنا ذاتی کیمرا خریدا، جو اس زمانے میں ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ بقول مرزا صاحب:

''والدہ ماجدہ اور دونوں بہنوں کی میں نے تصویریں بھی بنائیں۔ اس سے پہلے خاندان میں خواتین کی تصویریں بنانے کا تصور بھی نہیں تھا۔''

یہ تصویریں 1872ء تا 1876ء کے درمیان میں بنائی گئی تھیں اور اب بھی خاندان کے ذاتی البم میں موجود محفوظ ہیں۔

زمانہ قلیچ بیگ

مرزا قلیچ بیگ کی ولادت سن 1853ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سندھ میں انگریزی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ دس برس قبل سن 1843ء کے فروری میں انگریز فوج نے حیدرآباد کے قریب میانی کے جنگل (Miani Forest) میں تالپور افواج کو شکست دے کر سندھ میں انگریزی حکومت کی بنیاد رکھی۔ انگریز جنرل چارلس نیپیئر نے بعد میں بڑی سرعت سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے قلعہ حیدرآباد پر دھاوا بول دیا۔ اور امیرانِ سندھ کو حراست میں لے کر انہیں سندھ بدر کر دیا۔ اب ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کے احکامات کے تحت چارلس نیپیئر سندھ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں سندھ کی سرحدیں مشرق میں سبزل کوٹ، شمال میں خان گڑھ (جیکب آباد) جنوب میں نگر پارکر اور صحرائے کچھ اور مغرب میں بحیرہ عرب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چارلس نیپیئر نے سندھ کو تین اضلاع کراچی، حیدرآباد اور شکارپور میں تقسیم کر کے وہاں کلکٹر، مجسٹریٹ۔ اور پولیس کے سربراہ کے اہم عہدوں پر انگریز افسران کا تقرر کیا۔ اس طرح اس نے سندھ کی مالی، انتظامی اور سیاسی امور پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ چار برس بعد سن 1847ء میں چارلس نیپیئر گورنر سندھ کے عہدے سے سبکدوش ہو کر واپس انگلستان چلے گئے اور سندھ کی انتظامی حیثیت میں تخفیف کر کے اسے بمبئی صوبے سے ملحق کر دیا گیا۔

اب حکومت سندھ کی سربراہی کے فرائض ایک کمشنر سرانجام دینے لگے۔

انگریزی عہد حکومت سے قبل صدیوں سے سندھ میں مطلق العنان شخصی حکومت قائم تھی۔ اور سارے اختیارات حکمران اور اس کے امراء کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اس ملوکیت کی وجہ سے پورے سماج پر پسماندگی، افلاس، جہالت، بے یقینی اور عدم تحفظ چھایا ہوا تھا۔ سندھ بنیادی طور پر ایک کاشتکاری اور مویشی بانی کا معاشرہ تھا۔ جسے اس وقت بلوچ سرداروں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ حیدر آباد، میر پور خاص، اور خیر پور ان سرداروں کے اہم مرکز تھے۔ پھر یہ مراکز بھی چھوٹی چھوٹی جاگیروں اور زمینداروں میں بٹے ہوئے تھے۔ جو بلوچ قبائل، سیدوں اور پیروں کے قبضے میں تھے۔ سندھ ایک جامد معاشرہ تھا۔ موئن جو دڑو، کی سات ہزار سالہ قدیم تہذیب کے عہد سے لے کر اس وقت تک ایک ہی ڈگر پر رواں دواں تھا، اور موئن جو دڑو کے زمانے کے کدال، پھاوڑے نہیئے، کھڈیاں، بیل اور بیل گاڑیاں چل رہی تھیں اور ہر طرف ایک معاشرتی جمود تھا۔ ملک میں کہیں بھی پکی سڑک نہیں تھی۔ دن میں کچی سڑکوں پر دھول اڑتی تھی اور رات کو اندھیرا ہوتا تھا۔ عام لوگ کچے گھروں یا جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ بعض گھروں میں گائے، بیل، بھینس یا بکری بھی سردی کے موسم میں اس کمرے میں ہوتی جس میں گھر کا مالک اپنے بال بچوں سمیت سوتا تھا۔ گندے پانی کے نکاس کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ دریا اور نہروں کے ذریعے آنے والے بغیر صاف کیے ہوئے پانی کو استعمال کیا جاتا تھا۔ ڈاک رسانی کا عوام کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا۔ مسجد اور مندر کے کچے صحن میں بیٹھ کر بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سکول اور کالج نہیں تھے کتابیں لکھنے والے عنقا تھے۔ اور ہر کتاب کو صحیفہ آسمانی جان کر کئی غلافوں میں لپیٹ کر گھر یا مسجد کے کسی کونے میں رکھ دیا جاتا تھا، رات کو گھروں میں تیل کے دیئے جلتے تھے۔ گرمیوں میں شدید گرمی ہوتی تھی۔ اور دن میں جلا دینے والی لُو چلتی تھی۔ بعض دنوں میں حبس کی وجہ سے لوگ رات رات بھر پنکھا جھلتے رہتے تھے اور سو نہیں سکتے تھے۔ اور دن بھر نیم اور پیپل کے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑے سوتے رہتے۔ موسم گرما میں کئی دنوں تک مسلسل مٹی اور ریت اڑنے کی وجہ سے طبیعتوں میں بے زاری اور کوفت ابھر آتی اور لوگ چڑ چڑے ہو کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے۔ سردار، پیر اور سید کی حکم عدولی کو مذہبی گناہ گردانا جاتا۔ سفر پُر خطر ہوتا تھا۔ ہر آدمی اپنا محافظ آپ تھا زندگی کی ہر آسائش اور سہولت حاکموں اور ان کے حواریوں کے لیے وقف تھی۔ عام آدمی کا جینا مرنا برابر تھا۔ حکومتِ وقت کو عوام کی بھلائی اور بہبود کے منصوبوں کا کوئی علم تھا ہی نہیں، محلات اور قلعے تعمیر کرنا اور مسجدیں مندر اور مقبرے بنانا ہی عوامی بھلائی کے کام سمجھے جاتے تھے۔ مسجد سے مدرسے اور مسافر خانے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ سندھ میں تالپور حکومت کے دور میں کوئی بھی ایسی عمارت تعمیر نہیں ہوئی جسے عالیشان کہا جائے۔ انگریز سیاح ہنری پاٹنجر (Henery Pottinger) کے بیان کے مطابق حیدر

آباد میں امیرانِ سندھ کے گھر اندر اور باہر سے بہت سادہ ہیں۔ محلات کے کوئی بھی کمرے تیس فٹ سے زیادہ چوڑے نہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی لکڑی معمولی قسم کی ہے۔ جس پر کوئی رنگ و روغن نہیں ہوتا۔ ان گھروں میں استعمال ہونے والی چیزیں ادنیٰ ہوتی ہیں۔ حیدر آباد شہر کا بازار کوئی خاص نہیں۔ گو اس میں کھانے پینے کی چیزیں بہ افراط ہیں۔ دیہاتوں پر عموماً ڈاکو، لیٹرے حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ اس لیے کسانوں اور کاشتکاروں کی حالت تشویش ناک تھی۔ ہر سال دریائے سندھ میں خوفناک سیلاب آتے تھے۔ اور ہر سال سندھ کے بے بس اور مظلوم دیہاتی اس کا شکار ہوتے تھے۔ کارو کاری کے الزام کے تحت کئی بے گناہ قتل ہو جاتے تھے۔ امیر لوگ اپنی لڑکیوں کی غیر قبیلے میں شادی کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ اس قسم کی کئی سماجی برائیاں سندھ کے معاشرے کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے تھیں۔

معاشرتی گھٹن کے ان حالات میں انگریز سندھ پر بہ آسانی قابض ہو گیا اور سندھی معاشرے کو بہتر اور پر امن بنانے کے لیے اقدامات ہونے لگے۔ کارو کاری کے نام پر قتل کرنے کی خبر سن کر چارلس نیپیئر سخت برہم ہوا اور انہوں نے مجرموں کو پھانسی دینے کے احکامات جاری کیے۔ اور اعلان کروایا کہ جو قتل کا مرتکب ہو گا وہ بھی ضرور قتل کیا جائے گا۔ اب سندھ میں لوگوں کو امن و تحفظ ملنا چاہیے۔ بیوپاری اور سیاح راستوں پر سے بہ حفاظت گزریں گے۔ فقط قاتلوں اور ڈاکوؤں کے لیے موت ہے، یہ قانون الٰہی ہے جو سب کے لیے یکساں ہے۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے لیے خدا کے اس قانون کو لاگو کیا جا رہا ہے۔

جنرل چارلس نیپیئر نے سندھ میں ہندوؤں کی ہمدردیاں تو پہلے ہی حاصل کر لی تھیں۔ اب انہوں نے بلوچ سرداروں کو منانے کے لیے ان کو اپنے پاس بلایا اور ان کی تلواریں ان کو واپس دے کر کہا:

> ''میرا حکم مانو، اس کے بعد جو جی میں آئے کرو، اس وقت تک جب منع نہ کروں۔''

نیپیئر نے ضبط کی ہوئی جاگیریں بھی ان کو لوٹا کر ان کی وفاداریاں خرید لیں۔ اور اپنے اقتدار کو ہر خطرے سے محفوظ کر لیا۔ اب انہوں نے سندھ میں ترقیاتی کاموں پر توجہ دی انہوں نے پرانی نہروں کو صاف کرنے اور نئی نہریں بنانے کے لیے محکمہ انہار قائم کیا۔ کسانوں اور مزارعوں کو وہ سارے قرضے معاف کر دیئے جو ان کو سابقہ حکومت نے دیے تھے۔ نیپیئر نے سندھ میں محکمہ پولیس کا اجراء کیا۔ ان کا یہ کام ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لیے ایک مثال بن گیا۔ لیکن انکا سب سے بڑا کارنامہ سندھ میں شعبہ انصاف (Judicial System) کا قیام تھا۔ انہوں نے احکامات جاری کیے کہ لوگ جس بات کو انصاف کہیں اس کو اہمیت دی جائے نہ کہ اس بات کو جسے قانون انصاف کہتا ہو۔ ان اقدامات کی وجہ سے

لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ان میں احساسِ تحفظ پیدا ہوا۔ لیکن امیرانِ سندھ (جن کو ملک بدر کیا گیا تھا) اور ان کے رشتہ دار اور ہندو ملازم (جن کو عامل کہا جاتا تھا) اس نئے نظام کے شاکی تھے۔ کیوں کہ تالپوروں سے حکومت چھینی گئی تھی اور عاملوں نے اپنے اعلیٰ انتظامی عہدے گنوائے تھے۔ بعد میں جاگیروں کی بحالی اور پنشنوں کے اجراء کی وجہ سے امیرانِ سندھ کو منایا گیا تھا اور عامل لوگ ملک میں اقتصادی ترقی کے زیر اثر پہلے سے بھی زیادہ خوش حال ہو گئے۔

سندھ میں چارلس نیپیئر کا قیام سن 1847ء تک رہا۔ اس کے جانے کے بعد سندھ کا صوبہ ممبئی سے الحاق ہوا۔ اور بارٹل فریئر سندھ کے کمشنر مقرر ہوئے۔ بارٹل فریئر نے اپنے دور حکومت (1847ء تا1859ء) میں صوبے کی انتظامی ضروریات پر بھر پور توجہ دی اور سڑکیں، پل، ڈاک بنگلے، مسافر خانے، ضلعی دفاتر کی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ انہوں نے سن 1852ء میں سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک (Sind District Dawk) کا اجراء کر کے پورے برصغیر میں ڈاک کے ٹکٹ کی پہل کی۔ سن 1853ء میں انہوں نے سندھ کو پہلا جدید سکول دیا۔ سن 1858ء میں سندھ ریلوے کمپنی نے کراچی سے حیدر آباد تک ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا۔ بارٹل فریئر نے کراچی میں ایک تجارتی میلے کا بھی اہتمام کیا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ وسط ایشیاء کے ممالک کی توجہ کراچی کی طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے وائسرائے ہند کو اپنی یہ تجویز قبول کرنے کے لیے آمادہ کیا کہ برطانیہ سے برصغیر کی طرف آنے والے بحری جہاز بمبئی پہنچنے سے پہلے کراچی کے بندر میں لنگر انداز ہوں۔ اس کی وجہ سے سندھ کی تجارتی اہمیت بڑھ گئی اور کراچی کو ایشیاء کی کنجی (Key Of Asia) کہا جانے لگا۔ سندھ میں پہلا کالج بھی بارٹل فریئر ہی کے عہد حکومت میں کراچی میں قائم ہوا۔ سندھی زبان کا موجودہ رسم الخط بھی بارٹل فریئر کی دلچسپی کی وجہ سے رائج ہوا۔ اور دفتری خط و کتابت کے لیے سندھی زبان کا استعمال عمل میں لایا گیا۔ انتظامیہ کی نچلی سطح پر سندھی زبان کو فروغ دیا گیا ابتدائی سکولوں کے استادوں، پٹواریوں، محکمہ انہار کے چھوٹے ملازموں پولیس کے سپاہیوں اور رفاہ عامہ کی دوسری ملازمتوں کے لیے صرف سندھ زبان کا جاننا ہی کافی سمجھا گیا۔ چنانچہ سندھ میں ایک نئی تمدنی زندگی جنم لے رہی تھی اور سندھ کے باشندے ایک انوکھی اور ترقی یافتہ دنیا سے متعارف ہو رہے تھے۔ گویا مرزا قلیچ بیگ کا ایسی ہی معاشرتی اور سیاسی پس منظر میں ذہنی ارتقاء ہوا تھا۔

قلیچ بیگ کے شب و روز

ملازمت سے سبکدوشی کے وقت قلیچ بیگ کی عمر 55 برس تھی۔ اس وقت سن 1909ء سے لے کر سن

1929ء میں اپنی وفات تک ان کا زیادہ تر وقت لکھنے، پڑھنے، عبادت و ریاضت کرنے اور رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھے اور مجلس آرائی پر گوشہ نشینی کو فوقیت دیتے تھے۔ روزانہ حسب معمول صبح تین بجے نیند سے اٹھتے تھے۔ تہجد کی نماز پڑھتے، کائنات و زندگی پر غور و فکر کرتے۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ پھر فجر کی نماز پڑھ کر سیر کو نکل جاتے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے سیر کرنے کے بعد واپس آ کر ناشتہ کرتے اور کوئی کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ دن میں ایک بجے دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد تھوڑی دیر لیٹ جاتے لیکن سوتے نہیں تھے، کیوں کہ دوپہر کو نیند نہیں آتی تھی۔ تین بجے ظہر کی نماز پڑھ کر پھر لکھنے کا کام کرتے اور عصر تک لکھتے رہتے۔ پھر عصر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی بیٹھک کے صحن میں جا کر کتابیں مطالعہ کرتے یا اخبارات پڑھتے تھے۔ سورج غروب ہونے پر مغرب کی نماز پڑھتے اور گھر میں جا کر بچوں سے دل بہلاتے یا ان کو پڑھاتے تھے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر تھوڑا وقت ٹہلتے اور نو یا بعض اوقات دس بجے سو جاتے تھے۔ حالاں کہ ان کا بڑھاپا شروع ہو چکا تھا، لیکن ملازمت کے زمانے کی جدوجہد، روزانہ ورزش تندرستی اور پرہیزگاری کی وجہ سے وہ خود کو جوان سمجھتے تھے۔ اور اس زمانے میں پڑھنے لکھنے کا کام کچھ زیادہ ہی کرنے لگے تھے۔ وہ نہ صرف اپنی کتابیں ترجمہ و تالیف کرتے بلکہ دوسرے لکھنے والے جو بھی مواد نظر ثانی کے لیے ان کی خدمت میں بھیجتے وہ بھی تصحیح کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کتاب لکھنے کے سلسلے میں ان سے امداد کی درخواست کرتا تو اسے مایوس نہیں کرتے تھے۔ پھر مختلف رسائل کے لیے مضامین اور شعر لکھتے کتابوں کے تعارف و مقدمے تحریر کرتے، ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر تھے۔ محکمہ تعلیم کی جانب سے عربی، فارسی، اردو اور سندھی کی کتابیں آراء کے لیے ان کے پاس آتی تھیں۔ جن پر تبصرے لکھتے تھے۔ کسی ادبی، مذہبی یا سماجی انجمن کی فرمائش پر لیکچر دیتے یا مضامین قلمبند کرتے تھے۔ مختلف محکموں میں جو انگریز ملازمین تھے۔ ان کے لیے سندھی زبان کا سیکھنا لازمی تھا۔ چنانچہ ان کے امتحانات کے سلسلے میں بھی قلیچ بیگ سے رجوع کیا جاتا تھا۔

حیدرآباد میں تحفظِ حیوانات کی سوسائٹی کے نائب صدر بھی رہے۔ اس سوسائٹی کے لیے بعض اوقات مضامین بھی لکھتے تھے۔ انجمن اسلامیہ سندھی انجمن امامیہ (حیدرآباد سندھ) اور کل ہند شیعہ کانفرنس کی مرکزی کمیٹی اور اس کے پبلسٹی کمیٹی کے رکن ہونے کی وجہ سے بھی اُن کو اکثر ضروری مضامین لکھنے پڑتے تھے۔ 19 مارچ سن 1917ء کو کراچی میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت کے فرائض مرزا صاحب ہی نے انجام دیے تھے۔ اپنی شرافت، نیک نامی، علمی بصیرت اور ادبی شہرت کی وجہ سے قلیچ بیگ کو سندھ بھر میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ کم عمری ہی میں وہ سندھی علم و ادب کی دنیا کی ایک قدر آور شخصیت بن گئے تھے۔ جن کا علمی و ادبی حلقوں کے علاوہ حکومتِ وقت کے اعلیٰ طبقوں میں بھی احترام کیا جانے لگا

تھا۔ انہیں شیکسپیئر سندھ کا لقب دیا گیا۔ ان خدمات کے صلے میں کمشنر سندھ نے 16 فروری سن 1922ء کو حیدر آباد میں اپنے دربار کے موقع پر ایک فرمان کے ذریعے ان کی تعریف وتوصیف کی۔ اور ایک طلائی گھڑی بطور انعام پیش کی۔ 15 دسمبر 1924ء کو بمبئی کے گورنر نے حیدر آباد سندھ میں ایک دربار منعقد کیا اور حکومت ہند کی جانب سے قلیچ بیگ کو شمس العلماء کی سند، تمغہ، چوغہ اور دستار سے نوازا گیا۔ ان ہی دنوں ان کے دوست افسران نے ان کو میونسپل کونسلر یا لوکل بورڈ کا ممبر منتخب ہونے یا اسپیشل مجسٹریٹ یا بینچ مجسٹریٹ بننے کا مشورہ دیا۔ لیکن انہوں نے معذرت کی۔ جب ریاست خیر پور میں وزیر کی ضرورت ہوئی تو پہلے والیٔ ریاست میر علی مراد خان نے اور بعد میں میر فیض محمد خان نے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے قلیچ بیگ کو خطوط لکھے اور پیغامات بھیجے۔ لیکن انہوں نے شکریے کے ساتھ معذرت کی۔ دراصل اب ان کو گوشہ نشینی اور تنہائی میں ایک گونہ سکون محسوس ہونے لگا تھا۔

اس سلسلے میں انہوں نے اپنی رہائش گاہ سے تھوڑے فاصلے پر اپنے باغ میں املتاس کے ایک اونچے اور گھنے درخت پر ایک مچان بنوائی جسے وہ اپنا ''گھونسلا'' کہتے تھے اور بعض اوقات اس میں بیٹھتے اور تنہائی اور سکون کا لطف اٹھاتے تھے۔

قلیچ بیگ ہر مذہب وملت کا احترام کرتے تھے۔ وہ صلح کل کے حامی تھے۔ چنانچہ سندھ میں ان کے احباب کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جس میں مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی بھی شامل تھے۔ ان میں سے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ خود قلیچ بیگ کا بھی آخری عمر تک سندھ کے مختلف شہروں میں آنا جانا ہوتا رہا۔ انہوں نے اس سلسلے میں آخری سفر یکم اپریل سن 1929ء کو کیا جب مخدوم صاحب ہالا کی دعوت پر ہالا تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر میں ناہموار سڑک پر موٹر کے ہچکولوں سے ان کے گردے میں شدید درد اٹھا۔ چند دنوں کے بعد نمونیا ہو گیا۔ ان تکالیف کا فوری علاج ہوا اور تندرستی لوٹ آئی۔ ڈاکٹروں نے آرام کرنے کا مشورہ دیا لیکن ان سے بے کار بیٹھا نہ گیا اور وقتی آرام کے بعد حسب دستور اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ تین جولائی سن 1929ء کو اچانک بے چینی کے آثار پیدا ہوئے رات کو کھانا کھانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھی اور نو بجے کے قریب سو گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے آنکھ کھل گئی، کھانسنے لگے اور سانس لینے میں دقت محسوس کی اور پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانسی تو رک گئی لیکن سانس لینی مشکل ہو گئی۔ اچانک بلند آواز میں اللہ کہا اور ان کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

وفات سے کئی برس قبل قلیچ بیگ نے کربلائے معلی سے اپنے لیے کفن منگوا رکھا تھا۔ کچھ سال پہلے اپنے آبائی قبرستان میں اپنے لیے ایک پختہ قبر بھی بنوائی تھی۔ جہاں کبھی کبھی جا کر لحد میں سویا بھی کرتے

تھے۔ عمر کے آخری دنوں میں ہر ہجری سال کے شروع میں اپنی وفات کی تاریخ کا قطعہ بھی لکھتے تھے۔

وفات والے برس کا قطعہ ءتاریخ حسب ذیل تھا۔ جو ان کی لوح مزار کا کتبہ بھی ہوا۔

عمرم بہ ہمیں سال چو ہفتاد شدہ ہفت
آمد ملک الموت ز درگاہ حق آخر
گفتا کہ بسے زیستی در منزل دنیا
شو عازم عقبیٰ کہ بہ بینی رخ داور
از فرط مسرت زدم آہے و بہ مردم
در عالم ارواح رسیدم دم دیگر
تاریخ وفاتم چو دلم خواستہ ازغیب
ہاتف ز کرم کرد ندا بخت موقر

1348ھ

''ترجمہ: یعنی اس سال جب میری عمر 77 برس ہوگئی تو موت کا فرشتہ درگاہ الٰہی سے آیا اور مجھ سے کہا کہ تم اس دنیا میں بہت زیادہ وقت رہے ہو اب عقبیٰ چلنے کی تیاری کرو تا کہ داور کا دیدار کر سکو۔ میں نے ایک آہ بھری اور مر گیا اور جلد ہی عالمِ ارواح میں پہنچ گیا۔ جب میرے دل نے غیب سے میرے مرنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہی تو غیب کے فرشتے نے مہربانی سے جواب میں کہا ''اچھی قسمت والے''

علامہ عمر بن محمد داؤد پوتہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے میں ان کے دیدار فرحت آثار سے مستفیض ہوا۔ ان کا چہرہ مبارک بدرِ منیر کی مانند چمک رہا تھا۔ گلاب کی طرح دھک رہا تھا اور ان کی پیشانی سے نور جھلک رہا تھا۔ ان کی ریش کے سفید بال سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہے تھے وہ اس طرح سوئے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی جیتا جاگتا انسان میٹھی نیند سو رہا ہو۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ ایک عجیب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر۔ لوگ ان کے فراق میں نالاں و گریاں تھے جبکہ وہ خنداں و شاداں نظر آ رہے تھے۔''

غمِ روزگار

قلیچ بیگ اپنی سرشت میں شاعر اور بمبئی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ خوبرو نوجوان تھے۔ جنہیں اوائل عمر ہی میں سندھی، فارسی سرائیکی اور انگریزی زبانیں روانی کے ساتھ بولنے پر عبور حاصل تھا۔

بمبئی میں انہوں نے دوران تعلیم وکالت کے سال اول کا امتحان پاس کیا۔ ان کے اشعار کراچی کے فارسی اور انگریزی اخبارات و رسائل میں شائع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اور انہیں دنوں وہ کچھ عرصہ صحافت سے بھی وابستہ رہے تھے۔ چنانچہ کراچی کی اعلیٰ سوسائٹی سے بھی ان کے مراسم استوار ہوئے تھے۔ لیکن روزگار کا ہنوز کوئی مستقل وسیلہ نہ ہوا تھا۔ چنانچہ دوست احباب کے مشورے سے پہلے انہوں نے ضلع کراچی کے کلکٹر سے رجوع کیا اور ان کی اجازت سے کراچی کے متعلقہ آفس میں دفتری خط و کتابت وغیرہ کی بابت واقفیت حاصل کی اور جلد ہی مجسٹریٹ کا امتحان بھی دیا۔ یوں تو اس امتحان میں کئی امیدوار شریک تھے۔ لیکن قلیچ بیگ واحد امیدوار تھے جو کامیاب قرار دیے گئے۔ اس امتحان کا نتیجہ آنے تک قلیچ بیگ کا کراچی ہائی سکول میں فارسی زبان کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ لیکن ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ضلع شکارپور کی ایک تحصیل میں تحصیلدار کے دفتر میں ہیڈ محرر مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر 25 برس تھی۔ اس عہدے پر تین ماہ تک تربیت حاصل کرنے کے بعد تحصیل تھرڑی محبت کے تحصیلدار کے عہدے پر آپ کی ترقی ہوئی۔ یہاں ان کا قیام تین برس رہا۔ شہر کے قریب ہی رادھن نامی ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہاں نارتھ ویسٹرن ریلوے کا ایک اہم انجن شیڈ واقع تھا۔ جس کے اسٹیشن ماسٹر، ڈاکٹر، فورمین انجینئر وغیرہ انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔

ایامِ جوانی اور احساسِ جمال کی کارفرمائیاں

چوں کہ قلیچ بیگ اس تحصیل کے ایک اہم افسر تھے۔ لہٰذا رادھن ریلوے اسٹیشن کے انگریز ملازم ان کے ہاں ''تھرڑی محبت'' میں آنے جانے لگے اور قلیچ بیگ بھی ''رادھن'' جایا کرتے تھے۔ ابھی انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ چنانچہ رادھن کے ریلوے اسٹیشن ماسٹر مُرے کی بڑی صاحبزادی ایلس سے ان کی محبت ہوگئی۔

ایلس سے والہانہ محبت و قربت میں نوجوان شاعر قلیچ بیگ کی شاعری میں نئے پھول کھلے اور اس زمانے میں انہوں نے بڑی دل آویز شاعری کی۔ جو بعد ازاں ان کے مجموعے کلام ''سودائے خام'' میں

ظہور پذیر ہوئی۔ بہت جلد قلیچ بیگ نے مس ایلس سے شادی کرنے کے لیے ان کے والد سے اجازت چاہی۔ جو انہوں نے بہ خوشی دے دی اور شادی کی تیاری ہونے لگی۔ لیکن اچانک لاہور کے بشپ نے احکامات جاری کیئے کہ اگر دولہا عیسائی مذہب اختیار کرلے تو شادی ممکن ہوسکے گی ورنہ نہیں۔ قلیچ بیگ نے اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے ایلس کو بڑا دکھ ہوا اور قلیچ بیگ بھی اداس اداس رہنے لگے۔ جلد ہی مسٹر مرے کا تبادلہ سکھر ریلوے اسٹیشن پر ہوگیا۔ اور قلیچ بیگ بھی وہاں سے تبدیل ہوکر دوسری جگہ چلے گئے۔ بعد میں کچھ عرصے کے بعد انہوں نے کراچی کے رہنے والے ایک مائلس نامی انگریز کی صاحبزادی سے شادی کرنی چاہی جن سے کراچی میں قیام کے دوران آپ کے قریبی تعلقات ہوگئے تھے۔ اتفاق کی بات اس رشتے پر بھی اس طرح کے اعتراضات ہوئے جس کی وجہ سے قلیچ بیگ کو شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

تحصیل تھرڑی محبت سے تبدیل ہوکر قلیچ بیگ کچھ دنوں کے لیے تحصیل میہڑ میں رہنے کے بعد تحصیل جوہی اور بعد میں تحصیل وارہ میں رہے جہاں ان کا تین برس تک قیام رہا۔ اس عرصے میں کئی خوشحال گھرانوں سے شادی کے پیغامات آئے۔ لیکن انہوں نے ہر پیغام کو ٹھکرا دیا اور بالآخر 25 دسمبر 1888ء کو کراچی میں قلیچ بیگ کی شادی خیر پور ریاست کے سردار بہادر محمد اسماعیل شیخ کی صاحبزادی زلیخا سے انجام پائی۔ بعدازاں مرزا صاحب نے اپنی اس محبوب زوجہ محترمہ کا نام خیر النساء تجویز کیا اور جب تک وہ حیات رہیں مرزا صاحب انہیں اسی نام سے پکارتے رہے۔

قلیچ بیگ کی ہئیت مجموعی

اگرچہ مرزا قلیچ بیگ کی زندگی کے ہر عہد کے عکس ان کے تصویری البم میں محفوظ ہیں۔ اور خودنوشت سوانح حیات ''ساٹو پن یا کارو پنو'' (ساؤپن یا کاروپنو) میں اُن کے حالات زندگی بھی بیان ہوئے ہیں، مگر پھر بھی یہاں مختصر طور پر ان کے خدوخال کا ذکر ہوجائے تو کیا حرج ہے، آپ کے فرزند اسد بیگ کا بیان ہے کہ قلیچ بیگ کا قد، میانہ مگر مائل بہ درازی تھا، اعضاء متناسب، چست چھریرا بدن، گیہواں رنگ، رخسار گلابی، چہرہ خوبصورت و کتابی، آنکھیں بڑی بڑی، چہرے پر مناسب مونچھیں، متناسب داڑھی، نہ زیادہ دراز نہ بہت چھوٹی۔

ہاتھ پاؤں سبک اور پھرتیلے، چال ڈھال نہایت نستعلیق یعنی بہت تیز گام نہ سست قدم اگرچہ بہت ملنسار اور چہرے کے مجموعی خدوخال نرم و پرسکون، مگر پھر بھی آپ سے بے تکلف ہونے کی، کسی میں ہمت نہ ہوتی تھی۔

مغربی علوم سے گہری وابستگی کے باوجود صورت وسیرت میں مشرقی تہذیب اور شرافت کا سراپا پیکر نظر آتے تھے۔ تمام عمر کسی بھی سیاسی ادارے اور تنظیم سے وابستہ نہ ہوئے کہ ان کی پہلی اور آخری ترجیح سندھی علم وادب کی ترویج اور ترقی ہی، اور تمام عمر اسی مشن کے حصول میں کوشاں رہے۔

لباس وآواز

قلیچ بیگ گھر میں کرتے پاجامے پہننا پسند کرتے تھے۔ دوران سروس مغربی لباس میں ملبوس رہتے تھے اور سرکاری، ادبی تقاریب یا میٹنگس (Meetings) میں پینٹ کوٹ ٹائی زیب تن کرتے تھے۔ یہ لباس آپ کی شخصیت پر بہت جچتا بھی تھا۔ پاؤں میں بوٹ، گھر میں لیدر کی آرام وہ جوتی پہنا کرتے تھے۔ آخری عمر میں احتیاط ہاتھ میں چھڑی رہتی تھی۔ اگر چہ اس کی مدد کی بظاہر ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔

قلیچ بیگ خوش گلو تھے اور ایامِ عزا میں سوز خوانی و مرثیہ خوانی پورے خشوع وخضوع سے کرتے تھے۔ جوانی میں بے شک آپ کی آواز بھاری اور گرج دار رہی ہوگی۔ مگر آخری عمر میں بہت دھیمے لہجے میں بولتے تھے، کم سخن اور نرم گرفتار تو آپ سدا ہی سے تھے۔ معروف تعلیمی ماہر بزرگ خاتون وادی لیلا ہر چندانی نے لکھا ہے:

> ''74 سالہ قلیچ بیگ کو میں نے تقریر کرتے سنا تھا، ان کی آواز باریک تھی اور وہ بہت آہستہ بول رہے تھے، اور بیشک آپ کی آواز ہلکی پھلکی تھی مگر واضح طور پر بڑی دلنشین گفتگو کر رہے تھے۔''

دلچسپیاں اور مشغلے

قلیچ بیگ کو بچپن ہی سے عمدہ کتابیں رکھنے اور پڑھنے کا شوق تھا۔ اس بات کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی لائبریری میں ہر علم وفن کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو غالباً آپ کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ آپ نے ایسی تمام کتابوں سے ضروری حوالے الگ سے ایک نوٹ بک پر جمع کیے ہیں۔ جو ایک مسودہ کی صورت میں ان کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ آپ نے اپنے جمع شدہ اقتباسات پر مشتمل اس کتاب کا نام ''ابکار الافکار'' تجویز کیا ہے۔ باقیاتِ قلیچ کے طور پر اس کتاب کو بھی زیورِ اشاعت سے ضرور آراستہ ہونا چاہیے۔

آپ کا خانوادہ چوں کہ تالپور بادشاہوں سے متعلق تھا۔ لہٰذا بادشاہت کے خاتمے کے بعد کچھ قیمتی مسودات، قلیچ بیگ کے حصے میں بھی آئے۔ جو آپ نے دل وجاں سے محفوظ کیے۔ علاوہ ازیں ایامِ

جوانی میں آپ نے سندھی، اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں کی کتابیں امانتاً کراچی کی جنرل لائبریری میں رکھوائی تھیں، مگر بقول آپ کے:

''بعد میں جب ان کتابوں کی ضرورت مجھے پڑی تو اکثر کتابیں وہاں سے چرالی گئی تھیں''

اپنی نوشت سوانح میں آپ نے تحریر کیا ہے۔''

''جب بھی کوئی نئی کتاب لکھنا شروع کرتا ہوں تو لکھنے سے پہلے صفحے کے سرنامہ پر بسم اللہ ضرور لکھتا ہوں اور کتاب جب مکمل لکھ لی جاتی ہے تو اختتام پر ''الحمدللہ'' لکھنا کبھی نہیں بھولتا۔''

خوراک و لباس

''پیٹ بھر کر کھانا قلیچ بیگ کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جتنی بھوک ہوتی۔ ہمیشہ اس سے کم کھاتے۔ بقول آپ کے، میں بات بھی بہت مختصر کرتا ہوں۔''

چائے اور کافی آپ کے پسندیدہ مشروب تھے۔ سگریٹ، سگار، حقے ایسی کسی چیز کے قریب تک نہ گئے۔ کھانا اکثر ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے سے کھانا انہیں اچھا لگتا تھا۔ ہاتھ سے کھانے کو بھی ناپسند نہیں کرتے تھے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹہ چہل قدمی کرنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بعد چہل قدمی، رات کو جلد سو جاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا زیادہ تر کام آپ علی الصبح ہی کرتے تھے۔

قلیچ بیگ کی پرانی پوشاکیں اہل خانہ کے پاس اب تک محفوظ ہیں۔ خاص طور پر پیدائش کے بعد آپ کو جو ''پھران'' پہنایا گیا تھا، یا وہ لباس جو آپ نے شمس العلماء کا خطاب عطا ہونے پر زیب تن کیا تھا۔ ابتک ''نوادراتِ قلیچ'' میں محفوظ ہیں۔

قلیچ اور کھیل کود

قلیچ بیگ کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ آپ کی دیگر بہن بھائی کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے اور آپ کاغذ قلم دوات لے کر جو بھی کچھ جی میں آتا لکھتے رہتے۔ والدین کو ان کی عادتوں پر اکثر تعجب بھی ہوتا اور وہ انہیں دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں حصہ لینے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ بہر حال قلیچ بیگ کے ذہن کی تشکیل ونشو ونما کے لیے یا ان کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے والدین، انہیں طرح طرح کے رنگین کاغذ اور قلمدان فراہم کرتے رہے۔ اگر چہ کچھ دیر کے لیے وہ

اپنے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی بیگ کے ساتھ کھیل کود کر لیتے تھے اور اپنے ہم عمر دوستوں سے اکثر وبیشتر بچپن میں تاش بھی کھیل لیتے تھے اور کچھ عرصے کے لیے آپ کو پتنگ اڑانے، کنچے کھیلنے، چھپن چھپائی وغیرہ جیسے کھیلوں سے بھی دلچسپی رہی، مگر آہستہ آہستہ ان سب کھیلوں سے لاتعلقی اختیار کرتے چلے گئے۔

اوران سب کھیلوں کے مقابلے میں انہیں بیت بازی اور پہیلیاں بجھوانے جیسے مشغلوں میں زیادہ مزا آیا کرتا تھا۔ انہیں ایام میں، آپ نے اس وقت کے معروف گویئے احمد خان سے ستار بجانا بھی سیکھا تھا۔ اور اسے، اسکول میں اپنے دوستوں اور گھریلو تقاریب میں اکثر بجا لیتے تھے۔ اس کے سوا چھوٹے بڑے بھائیوں کی طرح کھیل کود یا شکار وغیرہ میں آپ نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔

قلیچ وسیع المشرب ادیب وعالم

قلیچ بیگ ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی ذات وصفات میں انتہائی روشن خیال، وسیع النظر، نہایت پابند صوم وصلوۃ اور تہجد گزار انسان تھے۔ آپ کو نہ صرف اپنی مادری زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ بلکہ انگریزی فارسی، عربی، ترکی، گجراتی، سرائیکی، مرہٹی اور اردو وغیرہ جیسی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ جدید علم وادب کے ساتھ تصوف ویدانت، اسلام اور صوفیا کے ابیات کی وجدانی کیفیات کا بھی آپ نے بغور مطالعہ کیا تھا اس لیے آپ کے روزمرہ کے معمولات بھی صوفیوں کی طرح سادہ اور تصنع سے پاک تھے۔ اپنے شعری افکار میں قلیچ بیگ حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمست کی طرح وحدت الوجود کے قائل تھے۔

تو عیاں میں نہاں ہے، نہاں میں عیاں
بے مثل وبے نشان، تم ہی ہو سب کے نشاں

ہر طرف جلوہ نمائی تیری
ہر طرف دیدہ کشائی تیری

دیگر مذاہب کے مطالعے اور اسلامی فقہہ اور علم الکلام کے اصولوں سے ہمیشہ آپ کو دلچسپی رہی۔ ہندو مذہب، تھیا سافی، تصوف، عیسائیت، بہائی ازم اور دیگر مذاہب کی کتابیں نہ فقط آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں، بلکہ آپ نے کئی ایک مذاہب کی کتابیں سندھی میں ترجمہ بھی کی ہیں۔ ایسی کتابوں میں انجیل، زبور، توریت اور تھیا سافی قابلِ ذکر ہیں۔ امام غزالی کی شہرہ آفاق ضخیم کتاب کیمیائے سعادت کا آپ نے نہ صرف انگریزی میں بلکہ سندھی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔

قلیچ بیگ جہاں شیعہ تنظیم انجمن امامیہ کے ممبر اور وائس پریذیڈنٹ رہے وہاں شیعہ سنی اتحاد یعنی انجمن اسلامیہ کے بھی ممبر اور وائس پریذیڈنٹ رہے تھے۔ جیسا کہ خود انہوں نے لکھا:

"نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پیغمبر اور حضرت علی علیہ السلام اور اہلبیت اطہار میرے پیرومرشد ہیں اور اولیاء و بزرگوں کے مزارات کو قدر، عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لہٰذا سندھ کے معروف بزرگ و اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت کے ساتھ ساتھ سندھ میں دور دراز علاقہ جات میں موجود درگاہ شاہ بلاول اور لاہوت لامکان کی زیارت سے بھی مستفیض ہوا ہوں۔"

خانوادۂ قلیچ کی ادبی خدمات

جہانِ ادب مرزا قلیچ بیگ کے ادبی کارہائے نمایاں سے تو بہ خوبی آگاہ ہے مگر ان کے بیٹوں، بیٹیوں بھائیوں اور دوسرے قریبی اعزاء کی علمی ادبی تخلیقات اور کارناموں سے بہت کم لوگ کماحقہ، آگاہ ہیں۔ چنانچہ یہاں مختصراً اس حوالے سے بھی عرض کیے دیتا ہوں۔

مرزا صاحب نے تین شادیاں کیں، آپ کی پہلی شادی 25 دسمبر 1888ء کو کراچی میں ہوئی۔ زوجہ محترمہ کا نام خیر النساء تھا اور آپ کے والد کا نام سردار بہادر شیخ اسماعیل تھا اور یہ خاندان خیر پور اسٹیٹ سے وابستہ تھا۔ اس خاتون سے آپ کے ہاں جو اولاد پیدا ہوئی اس میں سب سے نمایاں نام مرزا نادر بیگ کا ہے۔

"مرزا صاحب کے اس بڑے فرزند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے 1932ء میں جدید سندھی افسانے کی بنیاد ڈالی۔"

1912ء میں مرزا نادر بیگ نے لندن سے بار ایٹ لاء کیا تھا۔ ابتداء میں لاڑکانہ میں مجسٹریٹ رہے۔ بعد ازاں بیرسٹر رہے۔ "نادربیگ مرزا جون کھاٹیون" کے نام سے شائع شدہ آپ کا مجموعہ، جدید سندھی افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "محبوبِ کربلا" ناول اور "کلیاتِ نادر" بھی ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ قلیچ بیگ کی پہلی زوجہ محترمہ کا 1904 میں پلیگ کے باعث انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد 1907ء میں ان کی دوسری شادی ماموں زاد بھائی کی بیٹی ماہ رخ بیگم سے انجام پائی۔ اگلے سال یعنی 1908ء میں ایک بیٹا جنم دینے کے بعد اس خاتون کا بھی انتقال ہوگیا۔ بیٹے کا نام ہمایوں بیگ رکھا گیا۔

بعد ازاں ہمایوں بیگ سندھی ادب میں بہ حیثیت شاعر اور نثر نگار معروف ہوئے۔ ''فائق'' آپ کا تخلص تھا۔ ''حیات قليچ'' ''فرعون جي معشوقه'' ''کليات همايون'' آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

ہمایوں بیگ نہایت حسین وجمیل شخصیت کے مالک تھے اور ان کا شمار اپنے وقت کے نمائندہ شاعروں اور صاحب طرز نثر نگاروں میں ہوتا تھا۔

دوسری بیوی کے انتقال کے بعد 1909ء میں آپ نے تیسری شادی اپنے ہی خاندان میں کی۔ زوجہ محترمہ کا نام فیروز بیگم تھا۔ آپ کو اس خاتون کے بطن سے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ آپ کی بڑی بیٹی کا نام دلشاد بیگم ہے۔ جو 1910ء میں پیدا ہوئیں۔ دلشاد بیگم بڑی ہو کر نہ فقط اچھی شاعرہ ہوئیں بلکہ 1946ء میں آپ نے روزنامچہ کے انداز میں کربلا معلیٰ کی زیارت کے دوران میں ایک سفرنامہ بھی تحریر کیا تھا۔ 1913ء میں قلیچ بیگ کو جو فرزند عطا ہوا، آپ نے ان کا نام اسد بیگ رکھا۔ اسد بیگ بعد میں سندھی زبان کے بہت معروف قلمکار اور مقرر کے طور پر معروف ہوئے۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ کتب خانۂ قلیچ کی ترتیب، حفاظت اور مرزا صاحب کے مسودات کی اشاعت بیش تر آپ ہی کے زیر نگرانی ممکن ہو سکی۔

خانوادہ قلیچ میں آپ کے فرزند اجمل بیگ سندھی ادب کی معروف ادبی شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ قلیچ بیگ کی اکثر کتابوں پر آپ ہی نے بڑے شاندار و شاہکار پیش لفظ لکھے ہیں۔ ''دیوانِ اجمل'' اور ''دیوان فاضل'' آپ کی یادگار شعری کلیات ہیں۔

قلیچ بیگ کی دختر شہزاد بیگم بھی اعلیٰ پایہ کی شاعرہ تھیں۔ خاص طور پر آپ کے لکھے ہوئے حمد، نعت، سلام اور سوز غیر معمولی مقبولیت کے حامل رہے کہ ان میں بڑا ہی سوز و گداز پایا جاتا ہے۔

قلیچ بیگ کے فرزند افضل بیگ دینی عالم تھے۔ اور اس حوالے سے آپ نے تفہیم دین کے متعلق متعدد مضامین لکھے ہیں۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ 2006ء تک قلیچ بیگ کے تمام فرزند اور بیٹیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور اب ان کی اولاد میں فیروزہ اسد، اعجاز بیگ مرزا، محمد حبیب، فائزہ اعجاز، دلشاد منظور، اور مصطفےٰ و مرتضیٰ مرزا شعری و نثری تخلیقات سے والہانہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

مرزا صاحب کے بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ سندھی اور فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر مانے جاتے تھے۔ ''علم منطق'' آپ کی یادگار کتاب ہے۔ قلیچ بیگ سے چھوٹے مرزا علی قلی بیگ (انتقال 1904) ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر تھے، آپ ہفت زبان شاعر حضرت سچل سرمستؒ کے پہلے مولف گردانے جاتے ہیں ان کا مرتب کردہ ''کلام سچل سرمست'' آج بھی بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

''راقم الحروف (نصیر مرزا) بھی ایک لحاظ سے خانوادہ قلیچ ہی سے متعلق ہے

اور مرزا صاحب کی ہمشیرہ شرف النساء مرحومہ کے پوتے ہونے کی سعادت رکھتا ہے۔''

اولادیں

مرزا صاحب کی کل 18 اولادیں تھیں۔ آپ کی چار اولادوں کا کمسنی میں ہی انتقال ہوا۔ باقی میں گیارہ عدد فرزند اور تین عدد بیٹیاں تھیں۔ آپ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام بیرسٹر نادر بیگ مرزا ہے جو بعد ازاں سندھی زبان کے بلند پایہ افسانہ نگار ثابت ہوئے۔ آپ کے دیگر فرزندگان میں اختر بیگ، ہمایوں بیگ، اسد بیگ، افضل بیگ، اکمل بیگ، اجمل بیگ، ادھم بیگ، ارشد بیگ، اصغر بیگ، اور اطہر بیگ شامل تھے۔ اور آپ کی بیٹیوں کے نام یہ ہیں۔ فخر النساء، دلشاد بیگم اور شہزاد بیگم۔

قلیچ اور بمبئی

قلیچ بیگ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے 1872ء تا 1876ء تک بمبئی میں رہے۔ بعد میں وہ بمبئی آتے جاتے رہے۔ علاوہ ازیں بمبئی سے آپ کو خصوصی لگاؤ اس حوالے سے بھی تھا کہ 1823ء میں آپ کے نانا مرزا خسرو بیگ سندھ کے تالپور بادشاہ کے ایلچی کی حیثیت سے اس وقت کے گورنر ایلفنسٹن کے بھیجے گئے خصوصی پانی کے جہاز میں کراچی سے بمبئی گئے تھے۔ جہاں پہنچنے پر مرزا خسرو بیگ کو 21 توپوں اور دو ہزار سپاہیوں نے سلامی دی تھی اور چار گھوڑوں کی وکٹوریہ میں بٹھا کر آپ کو اعزاز کے ساتھ ان کے لیے مخصوص رہائش گاہ تک لے جایا گیا تھا۔ قلیچ بیگ نے لکھا ہے:

''بمبئی میں قیام کے دوران میں ایلفنسٹن کالج میں دوران تعلیم کالج کے پرنسپل چٹفیلوڈ ورڈس ورتھ، اگرینھام پروفیسر کینیڈی، پروفیسر جالکس، پروفیسر ہاتھارن تھویٹ، پروفیسر ٹیلر یونیورسٹی کے رجسٹرار جیمس ٹیلر پروفیسر مرزا حیرت، مولوی عبدالفتاح سے میری بڑی یاد اللہ رہی۔ اگرچہ یہ سب میری بمبئی کالج کے معزز اساتذہ تھے۔ مگر مجھے سب قریب رکھتے تھے۔ اور مجھ پر خاص طور پر مہربان رہے تھے۔''

''بمبئی میں رہائش کے دوران آغا خان (اول) بمبئی کے مشہور طیب جی خاندان، خاص کر مسٹر بدرالدین طیب جی سے میرے بڑے دوستانہ تعلقات رہے۔ اس خاندان کے ساتھ میرا بہت آنا جانا رہا۔

بمبئی کے پارسی خاندان کے جو افراد میرے عزیز ترین دوست رہے وہ تھے، مسٹر مانجی کاؤس جی، جے جے بھائی، مسٹر پٹیل، مسٹر دستور، مسٹر واڈیا وغیرہ۔ بمبئی کے مرہٹوں اور گجراتیوں سے بھی میرے بڑے دوستانہ تعلقات رہے۔ خاص کر مسٹر چندورکر، مسٹر جوگلیکر، مسٹر بھنڈارکر میرے زمانے کے مشہور لوگ رہے ہیں، سندھی ہمکلاس دوستوں میں سے مسٹر ڈیارام گدومل اور مسٹر علی محمد حسن علی سے تو میری گہری دوستیاں رہیں جو زندگی بھر قائم رہیں۔"

روزنامچہ بمبئی 1927ء

"28، جولائی۔ اپنے ماموں زاد بھائی کے بیٹے مرزا علی حسن بیگ کے ساتھ بہ غرض ایک ضروری میٹنگ بمبئی کے لیے روانہ ہوا۔ زوردار برسات ہو رہی تھی۔ مسٹر شاہانی (پی کے شاہانی) کے پدر بزرگوار بھی میرے ہمراہ تھے۔

29 جولائی۔ رات نو بجے احمد آباد پہنچے آگے راستہ بند تھا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار کو تار بھیجا گیا اور وہاں سے ہم ڈاکٹر منصور کے بنگلے پر رہنے کے لیے چلے گئے۔

9 اگست احمد آباد سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن بمبئی پہنچ گئے۔ اتوار کو باندرا گئے اور مسٹر ڈیارام گدومل سے جا کر ملے (مرزا صاحب کے بہترین دوست)

8 اگست کو وہاں پر مسٹر دستور سے پچاس برس بعد ملاقات ہوئی۔

10 اگست بمبئی سے ہم روانہ ہوئے۔ 11 تاریخ احمد آباد پہنچے مسٹر کنسٹر ڈکٹر سے ملاقات ہوئی بعد میں شاہ عالم کے روضہ کی زیارت کی۔

12 اگست صبح احمد آباد سے روانہ ہوئے اور 13 تاریخ کو حیدر آباد پہنچ گئے۔ بیٹا اسد بیگ اور بھتیجا حیدر قلی بیگ میرے لیے وہاں منتظر تھے۔

24 اگست پھر بمبئی گیا کہ بمبئی یونیورسٹی میں میٹنگ تھی۔ 27 تاریخ کو یہ میٹنگ ہوئی۔

29 کو پھر پونا گیا۔

25 جنوری 1928ء پھر بمبئی جانا ہوا۔ 27 تاریخ کو وہاں یونیورسٹی میں میٹنگ طے تھی۔

یکم فروری پھر وہاں سے واپس ہوئے۔ 15 فروری کو پھر میٹنگ کے لیے بمبئی جانا تھا مگر زوجہ محترمہ کی ناسازیٔ طبع کے باعث نہ جاسکا۔ 19 اگست بروز اتوار بمبئی جارہا تھا کہ پیٹ میں شدید تکلیف ہوئی۔ بہرحال میٹنگ میں پہنچ گیا۔ وہاں سے بغرض رہائش تاج محل ہوٹل میں رہا۔ تکلیف جاری رہی۔ معلوم ہوا گردے میں انفیکشن ہے۔ خیر اللہ کا کرم ہوا۔ دوران واپسی کوئی دقت پیش نہ آئی مگر گھر پہنچتے ہی بخار آ گیا۔''

نوٹ: ''مرزا صاحب کا بمبئی کا یہ آخری پھیرا تھا اور گیارہ ماہ بعد 1929ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔''

معاصرِ قلیچ

قلیچ بیگ (جیسا کہ بیان کیا گیا ہے) سندھ کے سب سے بڑے تہذیبی مرکز اور سب سے بڑے اور خوشحال شہر حیدرآباد میں 17 اکتوبر 1853ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور پرنویس مصنف اور پُرگو شاعر کے طور پر صرف حیدرآباد سندھ ہی میں نہیں بلکہ برصغیر کے ممتاز شہریوں اور مصنفوں میں شمار ہوئے حیدرآباد شہر جو بڑے بڑے رئیسوں اور خوشحال ہندو سرمایہ داروں سے چھلک رہا تھا۔ ان سب میں وہ شمس العلماء بن کر جگمگائے۔

برصغیر میں رابندرناتھ ٹیگور قلیچ بیگ کے اہم ہم عصر تھے۔ ان سے آپ کی ملاقات بھی ہوئی۔ غالب ومیرانیس، مرزا دبیر نوجوان قلیچ بیگ کے زمانے میں موجود تھے۔ 1874ء میں میرانیس کے وصال کے وقت قلیچ بیگ 21 برس کے نوجوان مصنف بن چکے تھے اور اپنی زندگی کی پہلی کتاب (ہارا ٹاہول) (بچوں کے لیے نظمیں) مرتب کر چکے تھے۔ گویا بہ حیثیت شاعر قلیچ بیگ میرانیس کے بڑے صاحبزادے میر خورشید نفیس کے ہم عمر و ہم عصر تھے۔ اور نہایت جلد 25 سال کی عمر میں سن 1877ء میں آپ نے لارڈ بیکن کے انگریزی میں لکھے دقیق مضامین کا مجموعہ مقالات الحکمت کے نام سے سہل و آسان سندھی زبان میں پیش کیا۔ یہاں معاصر قلیچ کے تذکرے سے پہلے معلوم رہے کہ سال 1924ء میں آپ کے بیش بہا ادبی خدمات پر آپ کو شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد وہ پہلے

مسلمان عالم تھے جنہیں اس گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ بعد میں مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نظیر احمد، مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی کو بھی یہ اعزازت عطا کیے گئے مگر مسلمانانِ سندھ میں قلیچ بیگ ایسی پہلی بڑی شخصیت تھے کہ جنہیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

عین 1853ء میں جب سر بارٹل فریئر جدید سندھی الفابیٹ تیار کروا رہے تھے۔ سندھ میں قلیچ بیگ کی ولادت ہوئی تھی۔ 1858ء میں قلیچ پانچ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ جرمن اسکالر ڈاکٹر ٹرمپ نے ٹائپ میں پہلا سندھی ریڈنگ بک تیار کروایا تھا۔ 1866ء عیسوی میں جب قلیچ تیرہ برس کے تھے۔ ڈاکٹر ٹرمپ کی کوششوں سے سندھ میں حضرت شاہ لطیف بھٹائی کا رسالہ'' شاھ جو رسالو '' پہلی مرتبہ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا تھا۔

نوجوان قلیچ بیگ کے لیے شاہ کا یہ رسالہ اشعار و وکار کے چمکتے موتیوں کا ایک خزانہ ثابت ہوا اور بہت جلد اس رسالے کی ہی بنیاد پر شاہ سائیں پر آپ نے اپنی تحقیق کا آغاز کیا۔

علاوہ ازیں زمانہ قلیچ یا اسکے آس پاس، برصغیر (ہند و سندھ) ایشیاء و یورپ میں جو معروف شخصیات دنیائے ادب میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی تھیں۔ اُن کا تذکرہ بھی یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گویا مرزا قلیچ بیگ اپنے ایامِ زندگی (وفات 1929ء تک) نہ صرف ان معروف شخصیات کی ادبی تخلیقات سے براہ راست آگاہ تھے بلکہ ان میں سے اکثر کے ادب کا آپ نے مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ مثال کے طور پر (معروف بنگالی ناول نگار شرت چندر (جنم 1876ء) رابندر ناتھ ٹیگور (وفات 1940ء) سر سید احمد خان (وفات 1898ء) منشی پریم چند (وفات 1936ء) شاعر مشرق علامہ اقبال (وصال 1938ء) سجاد حیدر یلدرم (وفات 1946ء) شمس العلماء علامہ عمر بن محمد داؤد پوتا (وفات 1958ء) میر عبدالحسین خان سانگی (وصال 1924ء) معروف روسی ناول نگار دوستوفسکی (انتقال 1881ء) شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (وصال 1910ء) علامہ ڈپٹی نذیر احمد (وصال 1910ء) ڈاکٹر اینی بسنت (انتقال 1907ء) روسی افسانہ نگار چیخوف (انتقال 1904ء) علاوہ ازیں دنیائے ادب کی عظیم شخصیات برنارڈ شا (آئرش ڈرامہ نگار) موپساں (امریکی ناول نگار) اور جس میں جوائس کا بھی کم وبیش یہی زمانہ تھا، کہ جب مرزا قلیچ بیگ حیدر آباد سندھ میں ٹنڈو ٹھوڑو نامی گاؤں میں صبح تا شام فروغِ سندھی ادب کے لیے کارہائے نمایاں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

مھد تالحد

یہاں مرزا صاحب کی خود نوشت سوانحِ حیات اور روز ناموں سے منتخب، دلچسپ واقعات، خود ان کی

زبانی تحریر کیے جارہے ہیں۔

''ہمارے آباؤ اجداد (والد و پدر بزرگوار) 1805ء میں جب ہجرت کر کے سندھ تشریف لائے اس وقت وہ ترکی و فارسی زبان بولتے تھے، سندھ میں آنے کے بعد سندھی خواتین کے ساتھ شادی کے باعث سندھی زبان سیکھی۔ اگرچہ اس زبان پر وہ پوری طرح سے دسترس نہ رکھتے تھے اور آخر تک صرف و نحو اور مونث مذکر کی پہچان کم رکھتے تھے۔

ابتدائی تعلیم میں نے اور میرے بڑے بھائیوں نے آبائی گاؤں ٹنڈو تھوڑو حیدرآباد میں ہی حاصل کی۔ ہمارے پہلے مدرس آخوند محمد شفیع ہوتے تھے۔ والدہ ماجدہ پڑھی لکھی خاتون تھی اور وہ گھر ہی میں میری بڑی بہنوں زیب النساء و شرف النساء کو خود پڑھاتی تھیں۔ بہنوں اور دیگر عزیز و اقرباء اور پڑوسیوں کی بچیوں کو بھی اماں پڑھاتی اور سلائی کڑھائی کا کام سکھاتی تھیں۔ والد مرحوم (فریدون بیگ مرزا) ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ جس کے نگ پر لکھا ہوتا تھا۔ عبدالراجی فریدون بیگ گرجی۔

نانا مرحوم (مرزا خسرو بیگ) بھی اس طرح کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ اور آپ کی انگوٹھی کے نگ پر جو الفاظ کندہ تھے۔ وہ تھے عبدالراجی خسرو بیگ گرجی۔

بچپن میں اکثر و بیشتر میں ایک ہی پلنگ پر بابا کے ساتھ سوتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے ساتھ ہم بہن بھائی کچھ دیگر ہنروں میں بھی طاق تھے۔ بابا بہت خوش گلو تھے۔ اور بہت اچھا گاتے تھے۔ بچپن سے ہم بھائیوں کو بھی گانے کا شوق تھا۔

لہٰذا میں نے اور چھوٹے بھائی علی قلی بیگ (مولف کلامِ چنچلؒ) نے بچپن میں سرندہ (سارندہ) بجانا سیکھا، جوان ہونے کے بعد میں نے ستار بجانا بھی سیکھا۔ اکثر و بیشتر کالج کی تقاریب میں ستار بجا کر سامعین کو محظوظ کرتا تھا۔ یہی شوق ہمارے بچوں میں بھی ہے۔ اور چھوٹوں میں کئی بچے بڑے خوش گلو ہیں اور ستار بجانے کے ساتھ ساتھ ہارمونیم پیانو وغیرہ بجانے پر خاص دسترس رکھتے ہیں۔

والد صاحب و نانا بزرگوار کے جن سنگی ساتھیوں کی زیارت اور ملاقات مجھے نصیب ہوئی وہ تھے۔ ہز ہائی نیس میر حسن علی خان (فرزند میر نصیر خان والئی سندھ) آغا زین العابدین شاہ، اٹھارویں صدی کے معروف سندھی اسکالر

دیوان شوقیرام۔ دیوان صاحب، والد مرحوم کے نہ فقط ہم سبق مگر قریبی دوست بھی تھے۔ بہت خوش خط تھے "سوکڙي" (سوکھڑی) مخزن کے مدیر دیوان کیول رام سے بھی مجھے نیاز حاصل تھی۔ علاوہ ازیں، ابتدائی زمانے کے معروف ترین نثر نگار، دیوان ادھارام تھانورداس اور معروف سماجی و تعلیمی خدمت گزار دیوان پربھداس کی بھی میں نے زیارت کی تھی۔

یکم اگست 1917ء میں حیدر آباد (سندھ) میں مکھی پریتم داس کے باغ میں منعقدہ ایک پارٹی میں گیا تھا۔ ہوم رول کانفرنس کے لوگ مدعو تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو اور مسٹر غلام علی چاگلہ یوسف علی بھائی اور دیگر معزز افراد سے ملاقات رہی۔ 5 اکتوبر اسی سال مسٹر پربھداس کی دعوت پر اپنی بسنت ہال حیدر آباد میں ڈاکٹر ہرنا مداس کا لیکچر سننے گیا۔ مجھے صدرِ مجلس بنایا گیا۔ رات دیر گئے تقریب کے اختتام پر منتظم مجھے اپنی وکٹوریہ میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے۔

24 فروری 1923ء مسٹر غلام علی نانا ماہرِ تعلیم والد جسٹس فیروز نانا کی دعوت پر ٹریننگ کالج حیدر آباد میں لیکچر دینے گیا۔ موضوع تھا دل ودماغ پر جسم کے اثراتِ 27 مارچ، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور حیدر آباد تشریف لائے۔ شام کی چائے ہم نے مل کر پی اور گفتگو کی۔ خاصی اچھی شخصیت کے مالک نظر آرہے تھے۔
15 ستمبر 1924ء حیدر آباد میں گورنر صاحب بمبئی کی دربار تھی۔ اس تقریب میں مجھے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ خطاب کے ساتھ سند، تمغہ، دستار اور چوغہ بھی عطا کیا گیا۔

میرے بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ (مصنف کتاب علمِ منطق) ٹالپور بادشاہ میر نصیر خان کے زمانے میں حیدر آباد کے پکے قلعے میں سن 1842ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بعد ان سے چھوٹے مرزا صادق علی بیگ (پہلے مسلمان گریجویٹ) سن 1845ء میں ٹنڈو سائیں داد میں پیدا ہوئے، کہ اس وقت تک انگریز سرکار، پکا قلعہ ٹالپور بادشاہ اور ہم سب کے خانوادے سے خالی کروا چکا تھا باقی کے ہم سب بہن بھائی ٹنڈو ٹھوڑو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔

بابا مرحوم فریدون بیگ مرزا چاہتے تو انگریز سرکار سے کوئی ذمہ داری اور آبرودار

نوکری حاصل کر سکتے تھے۔ مگر والد اور نانا بزرگوار مرزا خسرو بیگ نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ایسا کوئی کام نہ کریں گے۔ 1876ء میں والد ماجدہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت ہم آپس میں سات بھائی اور دو بہنیں ان کے آس پاس تھے۔ اور سب ساتھ رہتے تھے۔ 1861ء میں جس وقت والد بزرگوار پر نزع طاری ہوا۔ میرے دونوں بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ اور مرزا صادق علی بیگ حصول علم کے لیے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ دم آخر بابا میرے دونوں بھائیوں کے لیے تڑپ رہے تھے اور اشارے سے دونوں بھائیوں کی تصویریں جو سامنے دیوار پر آویزاں تھیں۔ وہ اُتروا کر سینے سے لگائیں اور آنکھیں بند کرلیں۔

میری پیدائش 1853ء کے بعد، چھٹے دن جو'' پھران'' (کرتا) مجھے پہنایا گیا تھا وہ آج بھی میرے عجائبات میں محفوظ ہے۔ گھر میں جب بھی کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا ہے تو بطور دعا سب سے پہلے نومولود بچے کو یہی پھران (کرتا) پہنایا جاتا ہے(153 سال گزر جانے کے باوجود یہ پھران آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔)
والدہ فرماتی تھیں کہ میں بچپن میں بڑا ضدی تھا۔ اور بات بات پر بہت بگڑ جاتا اور روتا تھا۔ مجھ میں اور میرے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی بیگ میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ ان کی پیدائش تک میں امی کا دودھ پی رہا تھا۔ علی قلی پیدا ہوئے تو اماں بتاتی تھیں میں انہیں، ان کے قریب ہی نہیں آنے دیتا تھا۔ اور ان کے حصے کا دودھ بھی پی جاتا تھا (لہٰذا بڑے ہونے پر) ماں بتاتی تھیں کہ وہ علی قلی کو مجھ سے چھپ کر اپنا دودھ پلاتی تھیں۔

ایک بار سندھ کے ایک گاؤں میں (نام نہیں لکھوں گا) منزل انداز تھا اور میں اپنے خیمے میں سویا ہوا تھا کہ رات کے اندھیرے میں پاؤں میں کسی شے کے لگنے سے آنکھ کھل گئی دیکھا کہ میرے پلنگ پر ایک جواں سال لڑکی بیٹھی تھی۔ میں لپک کر اٹھ بیٹھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ اس علاقے کے بڑے زمیندار کی بیٹی ہے اور میری تعریف و توصیف سن کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ سے ملنے کے لیے آگئی ہے۔ اس زمیندار سے میری بڑی یاد اللہ تھی اور اس وقت اگرچہ آتش جوان ہونے کے باعث میں آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ مگر میں

نے کچھ نہ کیا اور اس وقت گھر سے نکلی، اس دوشیزہ کو سمجھا بجھا کر عزت و آبرو کے ساتھ واپس گھر چھوڑ آیا۔

میری عادت ہے جب بھی کوئی نئی کتاب لکھنا شروع کرتا ہوں، پہلے صفحے کے سرے پر کونے میں باریک الفاظ میں لکھ لیتا ہوں۔ ''بسم اللہ'' اور جب کتاب لکھ لیتا ہوں تو آخری صفحے پر الحمد للہ لکھنا کبھی نہیں بھولتا، علاوہ ازیں دونوں جگہوں پر کتاب شروع کرنے اور اس کے ختم ہونے کی تاریخیں بھی ہر حالت میں درج کرتا ہوں۔

پہلا مقدمہ جو بطور مجسٹریٹ میں نے چلایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔
کسی عمر رسیدہ خاتون نے جنگل سے نمک آلودہ (کلر والی) مٹی اٹھا کر نمک تیار کیا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ الزام چوری پر لامحالہ میں نے اس پر ڈنڈ رکھا۔ مگر اس بزرگ خاتون کی غربت بے بسی پر رحم بھی مجھے بہت آیا۔ ظاہر ہے وہ ڈنڈ بھرنے کی اہل نہ تھی۔ اور بہرحال سزا کے طور پر اسے جیل ہی جانا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے نوکر کی مدد سے ڈنڈ کے وہ پیسے چوری چھپے اس خاتون تک پہنچائے اور اس طرح اسے باعزت بری کردیا۔ ریل کے سفر کے دوران بھی کئی فقیروں کا کرایہ میں نے ادا کیا اور انہیں سزا سے رہائی دلائی۔

شراب کو ہم حرام سمجھتے ہیں اور ہم سب بھائی اس علت و عادت سے پرے ہیں حتیٰ کہ ہم تمباکو نوشی کے بھی عادی نہیں، ماسوائے والدہ بابا کے۔ بعد کی پود میں سنا ہے کہ نئی نسل کے کچھ نوجوان سگار پیتے ہیں اور وہ بھی مجھ سے چھپ کر، کہ میں یہ بھی پینا پسند نہیں کرتا۔

موقع محل کی مناسبت سے میرے چاہنے والے میری تصویر، ادبی رسائل، پوسٹ کارڈ یا جنتری وغیرہ میں چھاپتے رہتے ہیں، کراچی کے ایک بڑے سیٹھ نے میری ایک قدِ آدم تصویر ہوم اسٹیڈ ہال میں آویزاں کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ ایک تصویر بمبئی ٹائمس آف انڈیا میں شائع کی گئی جس کے نیچے بطور کیپشن لکھا گیا۔
''شیکسپیر آف سندھ مرزا قلیچ بیگ'' اکثر تقاریب میں جب بھی جاتا ہوں۔

اختتام پر میرے ساتھ گروپ فوٹو بنائی جاتی ہے۔

سب نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔علی الصبح تلاوت کلامِ پاک بھی میرا روزانہ کا معمول ہے۔اکثر صبح چار بجے ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ہاتھ منہ دھو کر وضو کر کے تہجد نماز پڑھتا ہوں۔

ایک دفعہ گھوڑے پر سوار گشت پر جا رہا تھا کہ رستے میں ایک جگہ معلوم ہوا، کسی خاتون کا انتقال ہو گیا ہے۔قریب پہنچا تو پتہ چلا اس گھر میں مرد کوئی نہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو زار و قطار رو رہے ہیں۔گھوڑے سے اترا اور اپنے نائک اور اردلی کی مدد سے اس خاتون کے کفن دفن کا انتظام کیا۔اور فاتحہ کے لیے کھانے وغیرہ کا انتظام کیا۔بعد میں یتیم ہو جانے والے بچوں کے قریب گیا جو بلک بلک کر رو رہے تھے۔ان بچوں کا یہ رونا مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں خود بھی رونے لگا۔

میری لکھی اکثر کتابیں ماسٹر پوکرداس شکار پور والے اور ماسٹر ہری سنگھ (سکھر والے) پبلشروں نے چھپوائی ہیں۔علاوہ ازیں الحق پریس، وکٹوریہ پرنٹنگ ورکس اور پریمئر پریس والوں نے بھی میری بیش تر کتابیں شائع کروائی ہیں۔ جو سب میں نے انہیں بلا معاوضہ دی ہیں۔

16 دسمبر 1924ء مسلمانانِ ہند کانفرنس ہومسٹیڈ ہال حیدر آباد میں منعقد ہوئی سر رحمت اللہ صدرِ مجلس تھے اور صاحبزادہ آفتاب احمد صدر اردو ترقی کانفرنس بھی شریکِ محفل تھے۔علاوہ ازیں میر ایوب خان بھی موجود تھے۔میر صاحب اس موقع پر اردو سندھی مشاعرے کے صدر بنائے گئے۔اردو سندھی کی کئی معروف شاعروں نے مشاعرے میں حصہ لیا۔اس موقع پر میں نے، میرے بڑے بھتیجے منوچھر بیگ مرزا اور بیٹے ہمایوں نے بھی اپنی شاعری سنائی۔

10 اپریل 1929ء، مخدوم پیر غلام حیدر (سگے چچا مخدوم طالب المولیٰ) ہالا والے نے ایک عدد خط اور دو خدمت گار مع موٹر کار مجھے بھیجے کہ میں ان کے یہاں ہالا جاؤں۔لہٰذا گیا۔صبح دس بجے ہالا پہنچا، سید غلام مرتضیٰ شاہ (جی ایم سید) پہلے سے وہاں موجود تھے۔ایک کانفرنس کی بہ نسبت ہم سب نے صلاح و

مصلحت کی۔ یہاں سے میں قریب ہی حضرت شاہ لطیف بھٹائی" کے مزار پر زیارت کے لیے گیا۔اس موقع پر مخدوم نوح سرور رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر بھی حاضری دی۔ دوپہر کا کھانا مخدوم حویلی میں تناول فرمایا اور شام کی چائے کے بعد ہالا سے واپس حیدر آباد پہنچا۔

اکثر علی الصبح ،اکیلا صبح کی سیر کو نکل جاتا تھا اور راستے میں اجاڑ قبرستان، بزرگوں کے مقابر یا گاؤں کے ٹیلوں پر پہروں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ جہاں پر بیٹھ کر گردشِ زمانہ رفتارِ وقت ،حالاتِ انسانی اور خداوند تعالیٰ کی قدرت کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔

پنشن پر اترتے وقت (1910ء) میری عمر 55 سال تھی اور 25 برس کی عمر سے میں نے سرکاری نوکری اختیار کی تھی۔

موت کو ہر وقت یاد کرنے کے خیال سے میں نے اپنی پکی قبر اپنے آبائی قبرستان بلند شاہ میں تعمیر کروائی تھی۔ یہاں آس پاس میری والدہ (سکینہ بیگم) ہمیشرہ زیب النساء، چھوٹی بہن شرف النساء اور بڑے بھائیوں کی تربتیں پہلے سے موجود تھیں۔

ہر جمعہ پر میں وہاں جاتا ہوں اور اس تربت میں بیٹھ کر تلاوتِ کلام پاک کرتا ہوں۔ اور اپنے والدین اور بچھڑے ہوئے دوست احباب کو یاد کرتا ہوں۔ اپنی قبر کو دیکھ کر اسے کہتا ہوں۔ اے قبر! ایک دن میں بھی آ کر یہاں شہرِ خموشاں میں سو جاؤں گا۔ اپنا کفن پہلے ہی سے میں نے تیار کروا کر رکھ دیا ہے۔ بلکہ جنازہ اٹھانے کے لیے ڈولی بھی میں نے بنوائی ہے جو خاندان بھر کے مرحومین کے لیے کام آتی رہتی ہے۔

پیرانہ سالی اور خانہ نشینی کی حالت میں بھی، کثیر تعداد میں کتابیں لکھے چلے جانے کی وجہ سے مجھے میرا عزیز دوست دیوان کوڑومل ہنسی مذاق میں قلیچ بیگ کے بجائے، کتابیں تیار کرنے والی مشین کہہ کر مخاطب ہوتا ہے۔

اپنی شادی (25 دسمبر 1888ء) کے بعد جہاں میری تقرری ہوتی، بچوں کو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور جب ٹنڈو ٹھوڑو آتا۔ اپنے والدین کے اصلی مکان

میں آکر رہتا تھا۔ بعد میں (پڑوسی) میاں ابراہیم سے جگہ خرید کر کے میں نے اپنا مکان بنالیا۔

ہمارے گھر کے مغرب میں نانا مرحوم مرزا خسرو بیگ کا گھر تھا۔ ہمارے اصلی مکان کے مغرب میں جو بڑا کمرہ تھا بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ (مصنف کتاب علم منطق) شادی کے بعد رہنے لگے۔ بعد میں والد بزرگوار فریدون بیگ مرزا نے مختصر علالت کے بعد سن 1871ء میں اسی کمرے میں وفات پائی۔

1860ء کے آواخر میں نانا حضور مرزا خسرو بیگ جب زیادہ بیمار رہنے لگے تو زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے۔ میر صاحبان اور دیگر سرکاری افسران، کلکٹر وغیرہ ملنے کو آتے تو وہ سب گھر پر ہی ملتے۔ مجھے نانا مرحوم کے صرف صاحب فراش ہونے والے دنوں کی یادداشتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ اور اس کے علاوہ بس اتنا یاد پڑتا ہے کہ والد مرحوم اور وہ، گھنٹوں آپس میں علیحدہ بیٹھ کر ادبی باتیں اور ادبی بحث ومباحثہ کرتے رہتے تھے۔''

حیاتِ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ
سال بہ سال

پیدائش	1270ھ مطابق 17 اکتوبر 1853ء حیدرآباد سندھ
والد	مرزا فریدون بیگ (1871-1814ء)
والدہ	سکینہ بیگم دختر مرزا خسرو بیگ (وصال:1876ء)
ہائی سکول حیدرآباد میں پرشین ٹیچر	1872ء
ایلفنسٹن کالج بمبئی میں داخلہ	1873ء
میجسٹیریل میں کامیابی بحثیت تحلصیدار پہلا تقرر	1879ء
تعلقہ ٹگو سندھ	1880ء
ڈیپارٹمنٹل امتحان میں کامیابی	1890ء
ایکٹنگ ڈپٹی وسٹی مجسٹریٹ شکارپور۔ اور پھر	1891ء
روہڑی	1892ء
پہلی شادی	1888ء
نام زوجہ محترمہ	زلیخا شیخ المعروف خیرالنساء
بحثیت ڈپٹی کلکٹر لاڑکانہ	1893ء
ڈپٹی کلکٹر سیوھن شریف	1895ء
ڈپٹی کلکٹر جیکب آباد	1896ء
ڈپٹی کلکٹر تھرپارکر	1897ء
ڈپٹی کلکٹر نوشیرو فیروز سندھ	1898ء
ڈپٹی کلکٹر کوٹری	1901ء
ڈپٹی کلکٹر ٹھٹھہ وسجاول	1903ء

وفات زوجہ خیرالنساء	1904ء
قیصرِ ہند میڈل کا ملنا	1906ء
دوسری شادی (نام زوجہ محترمہ ماہ رخ بیگم)	1907ء
وصال زوجہ محترمہ	1908ء
تیسری شادی (نام زوجہ محترمہ فیروز بیگم)	1909ء
ریٹائرمنٹ، جگہ کوٹری ڈویژن	1910ء
شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا	1924ء
وصال	3۔ جولائی 1929ء
مدفن	بمقام بلند شاہ قبرستان ٹنڈو ٹھوڑ وحیدر آباد۔ سندھ

قلیچ بیگ کا اسلوبِ نثر

مرزا قلیچ بیگ سندھی ادب کے مکمل عہد کا نام ہے۔ وہ اپنی ذات اور تخلیقی اُپج میں ایک مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں جسے دیکھ کر بعد میں آنے والے اپنا قبلہ درست کرتے رہے۔ وہ ایسے ستارے کی مانند ہیں جس نے آسمانِ ادب پر بے شمار رنگ بکھیرے۔ ان کی ولادت سندھ میں تالپور بادشاہت کے خاتمے اور انگریزی اقتدار کے ابتدائی دنوں میں ہوئی۔ 1853ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ یہی وقت جدید سندھی رسم الخط کے آغاز کا زمانہ ہے۔ گویا مرزا قلیچ بیگ اور جدید سندھی رسم الخط ہم عمر ہیں۔ اس رسم الخط کو جسے دنیا کی قدیم زبان کا عظیم رسم الخط کہنا چاہیے۔ بعد ازاں اسی کو نہایت خوبی اور ہنرمندی سے برت کر حسین ترین تاج محل سندھی ادب میں تعمیر کرنے والا بھی کوئی اور نہیں مرزا قلیچ بیگ ہی ہیں۔ بقول شیخ ایاز:

> ''شاہ لطیف کے بعد سندھ کی پانچ ہزار سالہ تہذیب میں مرزا قلیچ بیگ عظیم ترین ادبی شخصیت ہیں۔''

بیسویں صدی میں سندھی ادب کے افق پر کئی روشن ستارے نمودار ہوئے جن کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس عہد کے اہم اثاثے کے طور پر میری نظر میں صرف دو نام ہیں:

> ''نثر میں مرزا قلیچ بیگ اور شاعری میں شیخ ایاز۔ بلاشبہ مرزا قلیچ بیگ کے زمانے میں متعدد اہم مصنفین اور بھی تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ستارے تھے اور ان کے درمیان مرزا قلیچ بیگ تھے، ایک روشن سورج۔''

گویا سندھی جدید ادب کے اس دور میں کئی اور معمار بھی تھے، مگر ان کے درمیان مرزا قلیچ بیگ معمارِ اعظم کا درجہ رکھتے تھے آپ نثر نویس ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد لب و لہجے کے شاعر بھی تھے۔

اور یوں نثر و نظم میں علم ادب کے اس بحرِ بیکراں نے 457 کتابیں تصنیف کیں، جن میں 29 کتب شاعری کی ہیں۔ باقی 428 چھوٹی بڑی سب کتابیں نثر کی مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ مرزا قلیچ بیگ نے اپنے اشعار کی تعداد دس ہزار بتائی ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کے اندازے کے مطابق ان کے قلمی

صفحات کی تعداد دو لاکھ سات ہزار چار سو انچاس 207449 ہے۔ انہوں نے نثر نویسی کے لیے جو مختلف اسلوب اپنائے ان میں ڈرامے، ناول، قصے، افسانے، مضامین، سوانح اور مقالے وغیرہ شامل ہیں۔

ان اصناف میں جن موضوعات کو انہوں نے برتا ان میں اخلاقیات، مذہب، تصوف، فلسفہ، منطق، باغبانی، زراعت، گرائمر، تاریخ، تحقیق، لغت نویسی اور لطیف شناسی قابل ذکر ہیں۔ نثر کے اس بحر بیکراں نے جتنا طبع زاد کام کیا ہے۔ تقریباً اتنا ہی دیگر زبانوں کے سندھی تراجم کی صورت میں انجام دیا۔ ان تراجم کی گوناں گوں نثری خوبیوں کے باعث میں آپ کے انہیں تراجم کو تراجم کی بجائے طبع زاد کہنے میں حق بجانب ہوں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے غیر ملکی ادب کا صرف لفظی ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ اس زبان کے اعلیٰ ترین خیالات کو سندھی زبان و ادب کا حصہ بنایا اور آپ کے اس عمل کو اس طرح دیکھنا چاہیے جیسے شہد کی مکھی مختلف اقسام کے پھولوں کا رس کشید کر کے خوش ذائقہ اور صحت بخش شہد کے روپ میں جو چیز ہمیں دیتی ہے وہ صرف اور صرف اس کی اپنی تخلیق ہوتی ہے۔ کاش سندھی ادب کا کوئی فاضل نقاد اس طرف توجہ کرے اور مرزا قلیچ بیگ کے سندھی تراجم کا جائزہ لے کر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ مغرب و مشرق کے ناول نگاروں، ڈرامہ نویسوں شاعروں اور عالموں کے بہترین خیالات کا نچوڑ مرزا قلیچ بیگ نے جس حسن و خوبی سے پڑھنے والوں تک پہنچایا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ قلیچ بیگ مغرب کے جن مشاہیر سے متاثر ہوئے ان میں ولیم شکسپیئر، وکٹر ہیوگو، لارڈ بیکن، آرتھر کانن ڈائل، تھامس مور، فادر فرار، ڈین سوفٹ، رابنسن کروسو، ورڈز ورتھ، کولرج، شیلے اور کیٹس اور مشرق میں رومی، فردوسی، حافظ، سعدی، جامی، امام غزالی اور اردو میں کسی حد تک آغا حشر کاشمیری وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

مرزا قلیچ بیگ نے ہر ملک کے نئے اور روشن خیال ادب کے اعلیٰ خیالات کو سندھی میں روشناس کرایا۔ خاص طور پر ناولوں میں آپ نے زیادہ تر امریکی ناولوں کے تراجم کو ترجیح دی۔ شاید اس لیے کہ اس وقت کے امریکی ناولوں میں، نئے ملک اور نئے سماج کی تعمیر کا ذکر ہے اور ان میں معاشرہ کی اصلاح اور تعمیر کا جو پیغام ہے۔ اس وقت کے سندھ کو اس کی اشد ضرورت تھی۔ سندھ اس زمانے میں انگریزوں کے قبضے میں تھا اور اس وقت یہاں ایک نیا سماج پروان چڑھ رہا تھا۔ جن میں اسکول، کالج اور ہسپتال، لوکل باڈی انتخابات اور کسی حد تک جمہوریت کو رواج دینے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ گویا کہ سندھ میں بھی وہی سب باتیں پیدا ہو رہی تھیں جیسی کہ امریکی افسانہ نگار اور ناول نویس ملک کی تعمیر کے لیے اپنی تحریروں میں پیش کر رہے تھے۔ بحیثیت مصنف اپنی کمٹمنٹ کے حوالے سے مرزا قلیچ بیگ نے لکھا ہے:

''میرے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اچھی کتابیں لکھی جائیں۔ جن کے ذریعے انسانوں کی تربیت ہو اور انہیں فائدہ پہنچے۔ واضح رہے کہ کتاب لکھنے یا شعر کہنے

کے بعد اصلاحِ معاشرہ اور اس کی تربیت ہی اصل مقصد ہے اور لکھنے پڑھنے کے

حوالے سے یہی میرے پیشِ نظر رہا ہے، نہ کہ پیسہ کمانا۔

سندھی میں اپنے اس تخلیقی نقطہ نظر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے قصے، ناول، سوانحِ حیات اور آپ بیتی جیسی اصناف کو زیادہ پسند کیا ہے۔ کلامِ پاک میں بھی آیا ہے کہ کہانیاں سناتے رہو۔ گوتم بدھ نے کہا ہے:

''آدمی فطرتاً بچے کی نسل ہوتا ہے اور کہانیاں سننے میں اسے بہت زیادہ لطف آتا ہے۔''

اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں آج یہی کوشش ہو رہی ہے کہ تمام علوم کو بذریعہ سائنس فکشن ناولوں اور کہانیوں کے اسلوب میں بیان کیا جا رہا ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں میں مقبول ہو۔ سندھی سماج کو باخبر رکھنے کے لیے قلیچ نے بھی ایک سو سال پہلے ایسے ہی پراثر اسلوب کے ذریعے زیادہ سے زیادہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لکھنے کا یہ عمل عبادت اور خدمت سے عبارت ہے، انہوں نے اپنی کوئی بھی کتاب کسی بھی پبلیشر کو بغیر کسی معاوضے کے دی۔ مشہور اور سندھی ادب کا کوئی خیر خواہ یا سندھ پرست ادیب کیا آج اس روایت پر چلنے کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ قلیچ کی طرح اپنا مسودہ پبلیشر کو بنا معاوضے دے رہا ہے، شاید نہیں۔

زیادہ سے زیادہ اور طرح طرح کی کتابیں سندھی زبان میں لکھنے کا قلیچ کے پاس ایک واضح مقصد تھا، کہ سندھی زبان کی زمین نت نئے رنگ کے پھولوں سے سجائی جا سکے۔ قلیچ سندھی ادب کے ہیرے تھے۔ بیسویں صدی کے ادیبوں کی لکھی ہوئی مقبول ترین کتابوں میں قلیچ اور شیخ ایاز کی کتابوں کے مقابلے میں دوسرے کسی ادیب کی کتابوں کو رکھنا چاہیں تو ہمارے ہاتھوں کی دس انگلیوں میں سے زیادہ تر خالی چھوڑنی پڑیں گی۔ مگر جب قلیچ کی لکھی ہوئی 457 کتابوں میں مشہور اور اہم کتابوں کی گنتی کرنے بیٹھیں گے تو سانس پھول جائیگی۔ جانتا ہوں کہ قلیچ کی ایسی اہم کتابوں کے نام یقیناً قارئین کے علم میں ہوں گے۔ مگر پھر بھی یہاں دہرانے میں کوئی حرج نہیں۔

ان کی سوانحِ حیات ''سائو پن يا ڪارو پنو''، زینت، دلآرام (طبع زاد ناول) مقالات الحکمت (مضامین کا مجموعہ)، انکوائري آفيسر، فيروز دل افروز، شهزاده بهرام، حسنه دلدار (ڈرامے) ڏاڙهياري جبل جوسير (سفر نامہ)، لطیف شناسی پر مولف کی حیثیت سے ''شاه جو رسالو'' سندھی انگریزی میں احوال شاہ لطیف بھٹائی، لغات لطيفي وڪريمي - شاه جي رسالي جي ڪنجي - گلن جي نوڪري (ناولٹ)، حاجي بابا اصفهاني، شاه ايليا، ني گهر، سچي محبت اور بچوں کے لیے لکھی گئی مشہور کتب، شيطان

جي ناني، وامق عذرا، شهزادي قدم برگ، گيليور جو سيرسفر، لبا خان درزي وغیرہ وغیرہ۔

قلیچ بیگ نے 1898ء میں نثری نظم کا تجربہ اس وقت کیا۔ جب وہ تعلقہ مٹھی کے مختیار کار تھے۔ ان کے اشعار کی سب سے نمایاں اہم اور حیران کن خوبی یہ ہے کہ اس میں فارسی تراکیب، تشبیہ اور استعاروں کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔

جبکہ نثر میں ان چیزوں سے انتہائی پرہیز کرتے ہوئے آپ نے صاف ستھری سندھی زبان قلم بند کی ہے۔ قلیچ 76 سال دنیا میں رہے اور سات سال کی عمر سے لکھنے کی ابتداء کی لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً ستر برس قلم سے دوستی نبھائی ۔ یہاں میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اس عرصے میں انہوں نے دنیا کے ہر موضوع پر قلم اٹھایا مگر نہایت اعتماد سے یہ ضرور کہوں گا کہ:

> ''اپنے زمانے کا شاید ہی کوئی ایسا جدید یا قدیم موضوع یا صنف ہوگی، جس کو انہوں نے سندھی زبان میں روشناس نہ کرایا ہو۔ کہانیاں، ناول، مضامین، مقالے، ڈائری، سفرنامے، جدید نظم غرض کہ ان تمام اصناف میں انہوں نے گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔'' بقول آپ کے، کتابوں میں کچھ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں اور کچھ ملازمت کے دوران اور کچھ ملازمت کے بعد لکھیں تھیں۔ نثر میں ان کی پہلی کتاب ''حيدرآباد شهر جون ياد گيريون '' ہے۔

اس کتاب کے بعد 23 یا 24 سال کی عمر میں جب وہ 1877ء میں بمبئی کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھے۔ تو انہوں نے لارڈ بیکن کے مضامین کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ لگ بھگ 25 سال کی عمر میں لکھی ہوئی اس کتاب ''مقالات الحکمت '' کو سندھی ادبیات میں آج بھی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

1880ء میں قلیچ نے شاہ لطیف ؒ کی زندگی پر تحقیق کا آغاز کیا اس وقت ان کی عمر صرف 27 سال تھی۔ 1887ء میں انہوں نے سندھی اور انگریزی میں جو کتاب اپنے پڑھنے والوں کو دی اس کا نام ''احوال شاہ عبدالطیف بھٹائی'' ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنا ناول ''دلآرام '' تحریر کیا۔ ادبی مورخین اس ناول کو اس کی خوبیوں کی وجہ سے انکا طبع زاد ناول تصور کرتے ہیں۔

اسی سال یعنی 1888ء میں جب ان کی تعیناتی ضلع دادو کے شہر ککڑ میں بحیثیت مختیار کار تھی۔ انہوں نے نثر میں نہایت دلچسپ کتاب تحریر کی۔ اس کتاب سے ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

''ککڑ میں سیتا روڈ سے ایک لنگڑے اور کمزور قدم قدم پہ لڑکھڑانے والے گھوڑے پر پہنچا ہوں۔ میرے دفتر کا کمرہ قید تنہائی کے لیے جیتا جاگتا کالے اندھیرے ساگر جیسا، یا مویشی کے چھپرے جیسا ہے، البتہ کھانے میں چاولوں کے ساتھ چینی ملا ہوا دودھ میسر ہوا۔

اے گگڑ یہاں دیکھنے کے لیے کوئی خوبصورت چہرہ نہیں، کیوں کہ یہاں کی عورتیں مردوں سے زیادہ سخت مزاج ہیں اور اے گگڑ تیری دھول تو انسانی پھیپھڑوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔''

کتنے ہی ادیب اور مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ:

''قلیچ کے ناولوں اور افسانوں کی نثر سادہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہر جگہ ایسا نہیں۔ جہاں جہاں انہوں نے مصورانہ صورت حال بیان کرنا چاہی ہے وہاں انہوں نے تمام لوازمات کو خوبصورتی سے برت کے دکھایا ہے۔ مثلاً ان کے ناول ''ٽي گهر'' (تین گھر) کے ابتدائی جملے دیکھیے۔ ان جملوں کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم آج کی لکھی ہوئی یا موجودہ زمانے کی نثر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔''

قلیچ نے اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے اس ناول میں ایک عجیب سماں باندھ دیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''وہ اک گرم دن تھا، شام ہو رہی تھی، سورج ڈوب رہا تھا، آسمان فیروزے کے موافق چمک رہا تھا کہ اچانک چاند کی سفیدی نمودار ہوئی۔''

ناول 'گلن جي نوکري'' کے ابتدائی صفحے پر ناول کی ہیروئن 'میری' سیب کے درخت کو دیکھ کر بے ساختہ اپنے والد سے کہتی ہے۔

''ابا حضور یہ ذرا دیکھیے تو، ننھے ننھے شگوفوں سے بھرا یہ درخت، یوں لگ رہا ہے گویا کہ پھولوں کا کوئی خوبصورت گلدستہ ہے۔''

اپنی ہر کتاب کے پیشِ لفظ کے آخر میں قلیچ نے اپنے منکسر المزاج ہونے کا ثبوت دیا ہے اور یہاں بھی ان کی نثر کی انفرادیت قائم ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'' قارئین کی خدمت میں بس اتنا عرض، کہ جو غلطی انہیں نظر آئے خود درست فرمالیں اور بندہ پر خندہ نہ فرمائیں۔''

ان کے ایسے عاجزانہ جملے دیکھ کر مجھے خود قلیچ بیگ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

چھپی بلندی ہماری تھی خاکساری میں
زمین کھودی ہماری تو آسمان ملا

1885ء میں قلیچ، نصیر آباد تعلقہ میں مختیار کار تھے۔ اس وقت ان کی عمر 32 سال تھی۔ اس عمر میں انہوں نے ڈاڑھیاري جبل اور ''کتے کی قبر کی تلاش'' کا سفر اختیار کیا۔ روزنامچے کے انداز میں تحریر

کیے ہوئے ان سفرناموں کا نثری اسلوب حیرت انگیز، دلچسپ اور بے پناہ معلوماتی ہے۔ کاچھی کی زبان، زمینی نباتات، حیوانات اور روزمرہ زندگی، حتیٰ کہ اس علاقے کے لب و لہجے کو بھی اس سفر نامے میں محفوظ کرلیا ہے۔ یہ دلچسپ اور معلوماتی سفرنامہ کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے۔

''ڈھائی گھنٹے تک، کھیر تھر کی چوٹی پر چکر لگانے کے بعد، اتر کر ہم ترائی میں آگئے جہاں کہ ''کرڑ چھ'' نامی چھوٹی پہاڑی تھی۔ وہاں سے پنسیری نامی پہاڑ کی ڈھلان پر اتر کر، دوسری طرف، دھیان نامی گھاٹی سے گزرتے، ٹنڈی، پورے بارہ بجے پہنچے اور پھر وہاں ایک چھوٹی غار میں جا بیٹھے۔''

ایک اور جگہ پہاڑی پر ایک دیہاتی سے انہوں نے جو گفتگو کی ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

''زچہ و بچہ کے متعلق میں نے اس سے پوچھا۔ تو کہنے لگا، جیسے بکری بچہ دیتی ہے۔ بغیر دائی کے، وہ جنگل میں چلی جاتی ہے۔ اور زچگی کے دو چار روز بعد بچے کو لے کر گھر آجاتی ہے۔''

پہاڑی سے گزرتے ہوئے کڑاول کے مقام پر جب قلیچ کو پتھر کی ایک دیوار نظر آتی ہے تو وہ اس سے مطابقت رکھتا ہوا۔ ایک دیومالائی قصہ دلچسپی کے لیے شامل کردیتے ہیں۔

''یہاں یہ بات مشہور ہے کہ مولا علیؓ کے زمانے میں یہاں کافر دیو رہتے تھے، وہ یہاں پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ صبح کو گندم بوتے تھے اور شام کو فصل پک کر تیار ہوجاتی اور ایک ایک دیو، ایک ایک من گندم بھون کر سیروں سیروں مٹھی میں بھر بھر کر پھانکتے جاتے۔ بالآخر مولا علیؓ نے ان کافر دیوؤں کو یہاں پہنچ کر نیست و نابود کیا۔''

قلیچ 37 سال کی عمر میں 1890ء کے قریب اپنا طبع زاد ناول ''زینت''، مکمل کر چکے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنا ناول مراۃ العروس اس سے کچھ ہی پہلے مکمل کیا تھا اور مرزا ھادی رسوا کا ناول ''امراؤ جانِ ادا'' قلیچ کے ناول زینت کے بعد لکھا گیا ہے۔ زینت سلیس اور بامحاورہ زبان پلاٹ پر مصنف کی عمدہ گرفت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی اثر پذیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سندھ کے ہزار ہا، بیک ورڈ خاندانوں نے اس سے متاثر ہوکر اپنی بچیوں کو نہ صرف تعلیم دلوانا شروع کیا بلکہ اس کی ہیروئن کے نام پر اپنی بچیوں کا نام ''زینت'' رکھا۔

1885ء میں قلیچ نے شاہ لطیف کی زندگی کے بارے میں اپنی کتاب مکمل کی جس کا عنوان ہے ''احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی'' دعویٰ سے کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی جہاں اور تنویر عباسی کی تحقیق والے دل آویز اسلوب سے پہلے، لطیف کی زندگی کے بارے میں تحقیق کے لیے مرزا صاحب نے جو یہ نثری اسلوب اور انداز اختیار کیا، اس کی کوئی اور مثال مرزا قلیچ بیگ سے پہلے ان کے معاصرین کے ہاں قطعی نہیں ملتی۔ قلیچ کے اس دلکش اندازِ بیان کا یہ مختصر نمونہ دیکھیے۔

اس سلسلے میں: ''احوال شاہ لطیف''...... میں انہوں نے شاہ صاحب کی جائے پیدائش کا انکشاف اس انداز میں کیا ہے۔

بھٹائی صاحب ہٹئی پور نامی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور جس مقام پر آپ پیدا ہوئے اب وہاں ایک مسجد ہے۔ جواب بھی دور سے نظر آجاتی ہے۔

تحریریں اور تقریریں ''تحريرون ۽ تقريرون'' قلیچ کے لکھے ہوئے شاندار مقالات ومضامین کے مجموعے کا نام ہے اور ان تحریروں میں ''شعر جو شرف ۽ شان'' (شعر جو شرف اور شان) والے مقالے کو ان کی نثر کا اعلیٰ شہ پارہ کہا جاسکتا ہے۔ مقالے میں آپ کا اندازِ بیان ملاحظہ کیجیے:

> ''کیا شاعر اسے کہا جائے، جو قلم کاغذ لے کر پلک جھپکتے ہی کچھ مصرعے موزوں کرلے۔ نہیں! یہ کوئی شاعری نہیں۔ اور نہ ایسے لکھنے والے کو شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ایسی شخصیت تو ایک تتلی کی طرح ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنا رنگ دکھایا، دیکھنے والوں کو خوش کیا اور گم۔ اس کے بعد نہ اس کا نام، نہ نشان! شاعر تو وہ ہے، جو اپنے لوگوں کے ہر وقت ہمراہ رہے، نگر نگر چلتا رہے، اپنے ہم زبان کے دل کی باتیں، اپنی زبانی بیان کرتا رہے، جسے سن کر سب کے دل وجان کو سکون وآرام ملے اور سب یہ کہیں، ارے یہ تو ہمارے ہی دل کی بات کہہ رہا ہے۔ ایسے ہی کہنے والے کو شاعر کہا جائے گا۔ کہ جس کی خامشی بھی، بڑی مسحور کن لگتی ہے۔''

شاعری اور شاہ لطیف کی شاعری کے بارے میں قلیچ کی لکھی ہوئی یہ نثر اور ان کا یہ سنجیدہ، سادہ اسلوب انکشافات سے لبریز ہے۔

1901ء میں قلیچ کی عمر 48 برس تھی۔ اس وقت انہوں نے امام غزالی کی کتاب کيمياءِ سعادت (کیمیائے سعادت) کے ہزاروں صفحات پر مشتمل دانش کو، سندھی میں منتقل کیا ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے شیکسپیئر کا شہکار ڈرامہ رومیو جولیٹ، کنگ لیر اور ہیملٹ وغیرہ شہزادہ

بھرام، حسنہ دلدار کے نام سے سندھی میں ترجمہ کیے۔

1896ء میں انہوں نے روسی قلم کار گوگول کے مشہور ڈرامے انسپکٹر جنرل کو ایسی خوبی کے ساتھ سندھی میں ترجمہ کیا کہ اس کو، ترجمہ کی بجائے ان کی طبع زاد تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ''انکوائري آفیسر'' جو اس ڈرامے کے سندھی ترجمہ کا عنوان ہے۔ اپنے ماحول کرداروں کی زبان اور اپنی دیگر جزویات کے سبب مکمل طور پر سندھی ادب کے نثری خزانے میں گراں قدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے دیگر ڈراموں سے قطع نظر، اسی ڈرامے کے چند دلچسپ مکالمے پیش خدمت ہیں۔

''شہر میں ہر طرف یہ افواہ ہے کہ انکوائری آفیسر بس پہنچنے ہی والا ہے۔'' اور اس کے بعد پوسٹ مین کہتے ہیں:

''تحصیلدار صاحب! یہ ہنر تو کوئی ہم سے سیکھے۔ آپ ہمیں کیا سبق سکھا رہے ہیں، ہمارے پوسٹ ماسٹر صاحب تو رجسٹرڈ خطوں میں سے بھی نوٹ کھسکا لیتے ہیں...... بعد میں ہوتی رہیں انکوائریاں، ونکوائریاں...... کچھ نہیں ہوتا''

بعد میں جواباً تحصیلدار، ماسٹر صاحب سے کہتے ہیں: اسکول ماسٹر صاحب آپ بھی کچھ ہوشیاری پکڑیں۔ اپنے پرائے کچھ لڑکے، کچھ دنوں کے لیے جمع کر لیں۔

جب بھی آتا ہوں۔ پانچ چھ بچے بیٹھے نظر آتے ہیں اور رجسٹر میں چالیس پچاس لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ بھی حاضر......''

''اب اس بات کو اور پھر سے کہتا ہے کہ:

جانے دیں، کہ ہم سب کیسے ایماندار ہیں۔ یہ سب کو پتہ ہے!''

آپ خود غور کیجیے کہ ایسے مکالمات پڑھنے کے بعد کیسے گمان ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں کسی اور زبان سے ماخوذ ہیں۔ مزید یہ کہ یہ مکالمے اس زبان میں 110 سال پہلے لکھے گئے ہیں مجموعی طور پر مرزا قلیچ بیگ نے (23) ناول، (20) ڈرامے، (119) درسی کتب، (28) دینی اور اخلاقی تصانیف خواتین کے لیے، (۲۰) بچوں کے لیے، (17) فارسی زبان میں، (22) عربی زبان میں (3)، اردو میں (5) اور بلوچی میں ایک کتاب تحریر کی۔

قلیچ ایک آدرشی قلم کار تھے اور آپ کے نزدیک لکھنا ایک سنجیدہ عمل تھا، لہٰذا کسی بھی مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے وہ پوری طرح تیاری کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تصنیف و تالیف ہی ان کی کل وقتی

سرگرمی رہ گئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے یکسانیت سے بچنے اور تنوع قائم رکھنے کے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنایا۔ جس کے مطابق الگ الگ اصناف پر الگ الگ اوقات میں توجہ دی۔ مثلاً صبح کے وقت ناول، افسانہ اور قصہ، دو پہر کو ڈرامہ اور رات کو ترجمہ اور تحقیق کا کام۔

ہر قلم کار کی طرح قلیچ کی نثر کا اسلوب بھی ان کی اپنی زندگی کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ قلیچ مزاجاً رنگین مزاج نہ تھے، نہ مغرور اور نہ بناوٹی اور اپنے نظریات میں اتنے پختہ اور واضح تھے کہ کنفیوژن کا لفظ ان کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سامنے زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ خلق خدا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیے۔

دنیا کے بیشتر مشہور و معروف قلم کار نہ جانے کیا کیا پی کر اور کھا کر بعد میں لکھنے بیٹھتے تھے، ان کے مقابلے میں مرزا قلیچ بیگ جیسے عظیم قلم کار کی مثال پیش کرتا ہوں جو ان تمام آلائشوں سے پاک رہ کر پوری یکسوئی اور تن دہی سے علم و ادب کی خدمت کرتے رہے کہ وہ ان چند گنے چنے ادیبوں میں سے ایک تھے۔ جنہیں معلوم تھا کہ کیا لکھنا ہے، کب لکھنا ہے اور کیوں لکھنا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کن لوگوں کے لیے لکھنا ہے۔ اسی لیے انہوں نے بناوٹی، انداز اختیار کرنے کی بجائے معنویت سے پُر، سادگی کا راستہ اختیار کیا تھا۔

1923ء میں انہوں نے ''سائو پن یا کارو پنو'' (ساوَپن یا کاروپنو) کے نام سے اپنی خود نوشت تحریر کی۔ جس کا آغاز انہوں نے ایک شعر سے کیا ہے۔ یہ منسکر المزاجی جو اس شعر سے ٹپک رہی ہے ان کی عظمت کی نشانی ہے۔

ہر چہ دارد قلیچ آرد پیش
برگ سبز است تحفہ درویش
کہش گشت دفتر اعمال
زان سیہ روی با سفیدی ریش
عمبد احمق بدست بنو ثبت
مدح و ذم نیک و بدسانح خویش

آج 2006ء تک جب ہمارے پاس ایسے ادیبوں کی طویل فہرست ہے جن کی عمریں 70 سال سے زیادہ ہیں۔ مثلاً آغا سلیم، امر جلیل، سراج الحق، غلام ربانی آگرو اور مراد علی مرزا وغیرہ۔ دل چاہتا ہے کہ وہ بھی قلیچ بیگ کی طرح اپنی زندگی کا ''کالا پتا یا ہرا ورق'' ''سائو پن یا کارو پنو'' ضرور لکھیں۔

دنیا میں تھامس پین اور جیفرسن جیسے امریکی قلم کار، چیخوف، ٹالسٹائی اور گوگول جیسے روسی قلم کار، اپنی ساری کی ساری تحریریں پبلشروں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے تھے۔ اور آج یہ سب لکھنے والے اپنے اپنے معاشروں کے اندر انقلابی رہنما تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر انقلاب کے تصور کو اگر نعرے بازی سے ہٹ کر سنجیدہ سماجی انقلاب کا نام دیا جائے تو سندھ میں مرزا قلیچ بیگ ایک واحد انقلابی قلم کار نظر آتے ہیں، جنھوں نے دن رات ایک کر کے خلوصِ دل سے سندھ کے پسماندہ لوگوں کی بغیر کسی لالچ، کایا پلٹ دی۔ اس بارے میں بیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر شیخ ایاز کے یہ الفاظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

> ''میرے نزدیک صرف ایک سندھی اسکالر قابلِ عزت ہیں اور وہ ہیں مرزا قلیچ بیگ۔'' ان کے وسیع ذوق نے ان کو، اپنے دور کے گوناں گوں ادب سے روشناس کرایا۔ قلیچ بیگ ہمارے ادبی ذوق اور فکری انقلاب کے بانی ہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے شعور کے قالین کو دیکھتا ہوں تو اس میں کئی رنگ کے دھاگے ایسے ملتے ہیں، جنھیں بجا طور پر میں مرزا قلیچ بیگ کے کہہ سکتا ہوں۔ مختصر یہ کہ، شاہ لطیفؒ کے بعد قلیچ بیگ سندھ کی عظیم ترین ادبی شخصیت ہیں۔''

سندھی زبان کے کتنے ہی قلم کار ایسے ہیں جنھوں نے سندھی کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ مثلاً انگریزی وغیرہ میں۔

مگر مرزا قلیچ بیگ کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے سندھی کے ساتھ ساتھ انگریزی، فارسی، اردو، عربی اور بلوچی میں بھی منظوم اور نثری خدمات سرانجام تو دیں مگر یہ سب کچھ انہوں نے کسی کے کہنے پر یا کسی لالچ سے نہیں بلکہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے یا سندھ کے عوام کی قسمت بدلنے کے لیے کیا۔ میں اسی کو قلیچ کا ادبی نظریہ اور آدرش سمجھتا ہوں۔

قلیچ اور ان کے زمانے کے دیگر قلم کاروں کے تقابلی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریروں پر ہم عصر سندھی قلم کاروں میں سے کسی کا اثر نہیں۔ وہ ایک منفرد شخصیت اور منفرد اسلوب کے مالک تھے اور یہ بھی درست بات ہے کہ ان کے زمانے میں سندھی کے افسانوی ادب میں کوئی ایسا صاحب اسلوب ادیب موجود نہ تھا۔ اس لیے انہیں اپنی بات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کے لیے اپنا راستہ خود بنانا پڑا۔ قلیچ کے دور میں یا ان کے بعد ان کے پیش رو منشی ادھارام، تھانور داس، کوڑومل چندن مل، میراں محمد شاہ اول، شمس الدین بلبل، جیٹھ مل، لال چند، امرڈنومل، لیلیٰ رام، پریم چند، بھیرومل، مہر چند، حکیم فتح محمد سیوہانی، مولانا دین محمد وفائی بھی نثر لکھتے رہے تھے، مگر، سچ بات تو یہ ہے کہ ان سب معاصر و پیش رو لکھنے والوں میں قلیچ بیگ ہی وہ واحد شخصیت ہیں، کہ جن کا نام آج بھی سندھی ادب کے آسمان پر مثلِ

آفتاب جگمگا رہا ہے۔

قلیچ بیگ اور افسانوی ادب

قلیچ بیگ اپنے بے پناہ افسانوی ادبی سرمائے کے اعتبار سے سندھی فکشن (Fiction) میں نہایت منفرد اور اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ اور دیکھا جائے تو سندھی میں جدید افسانوی دور کا اوائلی عہد بڑی حد تک ان ہی کے گوناں گوں موضوعاتی تجربات اور متنوع تخلیقی نمونوں کا مرہون منت ہے۔

قلیچ بیگ نے خاص طور پر سندھ میں افسانوی اصناف کو نکتہ کمال پر فائز کر دکھایا تھا اور بجا طور پر شمس العلماء کا خطاب پایا تھا۔ بعدازاں آپ ہی کی روشنی سے سندھی علم وادب اور خصوصاً افسانوی ادب میں بیسیوں مشعلیں روشن ہو گئیں اور کئی مزید قندیلیں آپ سے رہنمائی پاتے ہوئے ہر طرف جگمگانے لگیں۔ قلیچ بیگ کی افسانوی کاوشیں، ناول ڈرامے افسانچوں اور بچوں کے لیے دلچسپ نثری ادب پر مشتمل ہیں۔ ان تمام اصناف کے حوالے سے دیکھیے تو وہ سندھی زبان کے افسانوی ادب میں ایک بنیادگزار (Pioneer) کی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ محض قصے کہانیاں ہی نہیں بلکہ ان میں اخلاقی جواہر مثلاً امن و بھائی چارے، رواداری، برداشت، عزتِ نفس، خواتین کے احترام تعلیم کی اہمیت اور اس کے ساتھ ساتھ جرأت، حوصلے اور مشکل حالات سے نبرآزما ہونے کی اہمیت واضح کی گئی ہے جو اس دور کی اہم معاشرتی ضرورت تھی۔

دولت کی جھوٹی چمک دمک، دکھاوے کے کھوکھلے پن سے نفرت اور محنت کی عظمت کو آپ نے بار بار اپنے آئیڈیل کرداروں کے توسط سے پڑھنے والوں تک پہنچایا ہے، زینت آپ کا وہ پہلا طبع زاد ناول ہے کہ جس کی ہیروئن زینت ایک حوصلہ مند خاتون کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے، آپ کا ترجمہ کردہ ناول ''غلامي ء مان متي چاڙھو''(Up From Slavery) افسانوی اسلوب میں لکھی گئی ایک آپ بیتی ہے اس ناول میں عدم مساوات پر بنی معاشرے پہ کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے حاجی بابا اصفہانی (جرمن ناول Movie سے ماخوذ) ہیں، مرزا صاحب نے اس ناول میں یہ سبق دیا ہے کہ اپنی تمام تر مشکلات پر سخت حوصلے سے فتح حاصل کی جاسکتی ہے پادری فرار کے ناول (Three Homes) کا ترجمہ آپ نے سندھی میں ''ٽي گهر'' ''تین گھر'' کے عنوان سے کیا ہے۔ کرسٹاف وان شمٹ کے ناول (Basket of Flowers) کا ترجمہ ''گلن واري ٽوڪري'' (گلن واری ٹوکری) کے نام سے کیا ہے۔

یہ ناول اپنی بُنت میں دل آویز انسانی جذبوں اور نفسیاتی گوشوں کو عیاں کرتا ہے۔

اس طرح (Dear Swift) کے قصے کو آپ ''گليور جوسير سفر'' (گلیور جو سیر سفر) اور Arabic nights کو آپ نے ''سنڌ باد جهازي'' (سند باد جہازی) کے نام سے،

Counen Dayle کی دلچسپ کہانیوں کو آپ نے "شرلاک هومزجا عجيب وغريب ڪم" (شرلاک ہومز کے عجیب وغریب کام) کے نام سے اخذ کیا ہے۔ 1880ء میں آپ نے سب سے پہلے "دلآرام" (دلارام) ناول تصنیف کیا تھا، اور اسی سال سندھی میں آپ نے اپنا پہلا opera تخلیق کیا "ليلي مجنون" (لیلیٰ مجنوں) سال 1887ء میں آپ نے "خورشيد" (خورشید) اور سال 1894ء میں "بڪانولي" (بکاؤلی) اور بعد ازاں اسی سال "لوڀي ۽ ٺوڳي" (لوبھی اور ٹھوگی) 1896ء میں "نور جهان ۽ جهانگير" (نور جہاں اور جہانگیر) اور 1892ء میں گوکول کے مشہور ڈرامے انسپکٹر جنرل کا ترجمہ آپ نے "انڪوائري آفيسر" (انکوائری آفیسر) کے نام سے پیش کیا، بعد ازاں سندھ کے معروف ادیب آغا سلیم نے اسے اردو میں ترجمہ کیا۔ جسے کچھ سال قبل الحمراہال لاہور میں قریباً ایک ماہ تک دکھایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں قلیچ بیگ نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامے ہیملیٹ Hamlet اور King lear کا ترجمہ بھی سندھی زبان میں کیا، یہ ڈرامے نہ فقط اپنے وقت میں سٹیج پر دکھائے گئے بلکہ بعد ازاں انہیں زیورِ اشاعت سے بھی آراستہ کیا گیا۔ اگرچہ قلیچ بیگ کی بیشتر افسانوی تخلیقات (ناول و ڈرامے) طبع زاد نہیں ہیں اور زیادہ تر انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ مگر آپ نے مقامی رنگ کی آمیزش سے ان میں طبع زاد افسانوی ادب کی سی شان پیدا کردی ہے اور اس طرح یہ تمام ترجمہ شدہ ناول اور ڈرامے قطعاً انگریزی یا دیگر مشرقی زبانوں سے ماخوذ یا ترجمہ محسوس نہیں ہوتے۔ یہ افسانوی تحریریں اس امر کی نشاندہی کرتی اور شہادت پیش کرتی ہیں کہ قلیچ بیگ میں ایک زبان سے دوسری زبان میں مطالب منتقل کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔ بدیسی خیالات اور مشکل کیفیات کے بیان میں قلیچ بیگ کہیں بھی اپنی مادری زبان کی بے مائیگی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی ہے اور روزمرہ کی سلاست اور وضاحت کے ساتھ فطری انداز میں ان کی نثر دریا کی طرح بہتی جاتی ہے۔

بلاشبہ قلیچ بیگ کی ایسی افسانوی کاوشوں کے باعث جدید سندھی نثر صاف شفاف لہجے، کفایتِ لفظی اور سادہ و سلیس طرزِ احساس سے روشناس ہوئی۔ آپ کے اختراع کردہ اسی اسلوبِ نثر کی گونج، سندھی ادب میں آج بھی سنی جارہی ہے۔

قلیچ بیگ اور بچوں کا ادب

قلیچ بیگ نے بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے جو خدمات سرانجام دیں، اس کا تذکرہ بھی یہاں لازمی ہے۔ آپ نے سب سے پہلے سترہ سال کی عمر میں جو پہلی کتاب لکھی وہ بچوں کی نظموں کے متعلق

تھی اوراس کا نام آپ نے رکھا" بارانا ہول" (بارانا بول) (بچوں کی نظمیں)

ایک اندازے کے مطابق مرزا صاحب نے تقریباً ساڑھے چار سو سے زائد کتابیں تحریر فرمائیں۔ اور کتب خانہ قلیچ کے ریکارڈ کے مطابق آپ کے لکھے مسودات کے صفحات قریباً 27458 درج ہیں۔

مرزا صاحب کی تحریر کردہ کتب میں اچھی خاصی تعداد بچوں کے ادب پر بھی مشتمل ہے۔ آپ کی تحریر کردہ یہ تحریریں مندرجہ ذیل چار حصوں پر مشتمل ہیں۔

1۔ ترجمہ شدہ کہانیاں اور قصے

2۔ ڈرامے اور سیاحت نامے

3۔ سائنسی کہانیاں

4۔ بچوں کے لیے شاعری

بچوں کے لیے آپ نے سب سے پہلے سال 1880ء میں ایران کے مشہور نیم تاریخی جنگی داستان رستم وسہراب کو منتخب کیا۔ اور اسے شاہ نامہ فردوسی سے ماخوذ کیا اس کے علاوہ بھی بیشتر کہانیاں اور قصے ،آپ نے مختلف ممالک کے لوک کہانیوں اور داستانوں سے اخذ کیں۔ آپ کی سندھی زبان میں تخلیقات میں جو نمایاں کتابیں تھیں ان کے نام سندھی میں یہ ہیں۔

1۔ وامق عذرا (وامق عذرا)

2۔ ايران داستان (ایران داستان)

3۔ شهزادھ گل منير (شہزادہ گل منیر)

4۔ الف ليلوي ڪهاڻي شمرانه عرف شيطان جي ناني (الف لیلوی کہانی شمرانہ عرف شیطان جی نانی)

5۔ قدم برگ شهزادي (قدم برگ شہزادی)

6۔ نيلو پکي (نیلو پکھی)

7۔ لبا خان درزي ۽ خليفو ڪنگ (لبا خان درزی ائیں خلیفہ کھنگ)

8۔ عجيب طلسم (عجیب طلسم)

9۔ ٻه جاڙا ڀائر (دو جڑواں بھائی)

قابلِ غور بات یہاں یہ ہے کہ ان تمام کہانیوں میں کہیں بھی جن بھوتوں جادوگروں اور خون ریزی کے قصے قطعی نہیں لکھے گئے ہیں اور تمام کہانیوں میں درس اخلاق دیا گیا ہے اور بچوں کو اچھے اخلاق نیک اطوار کی طرف راغب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے جو ڈرامے تحریر کیے ہیں ان میں خاص طور پر ایسی کہانیاں ڈراماٹائز کی ہیں کہ جن میں دکھایا گیا ہے کہ جو

اشخاص بچپن میں بہت غریب تھے اور مشکل حالات سے نبرد آزما تھے وہ کس طرح مسلسل محنت و جدو جہد سے بالآخر عزت و شہرت کے مالک بن گئے۔ مرزا صاحب نے سائنسی موضوعات کو بھی بچوں کے ادب میں متعارف کرایا ہے۔ آپ کی تیار کردہ کہانی "ٽي ڀوت يا راڪاس" (تین بھوت یا راکاس) ایک بہت ہی عجیب غریب کہانی ہے۔ بظاہر تو اس کہانی کے نام سے یہ تصور آتا ہے کہ یہ شاید بھوت پریت کے بارے میں ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے یہ کہانی دراصل بھاپ پانی اور ہوا کے کمالات کی کہانی ہے۔

ایسی ہی ایک اور کتاب کا نام "پٽيل اکيون پوريل اکيون" (سوتی جاگتی آنکھیں) اگرچہ اس کہانی کا نام بھی دیو مالائی سا ہے۔ مگر درپردہ اس کہانی میں مرزا صاحب نے بچوں کو سائنسی کھوجنا اور تحقیق کے گر سمجھائے ہیں۔

نثر نویسی کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ آپ نے اپنی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچوں کے لیے سندھی میں نظمیں لکھی ہیں اور یہ دلچسپ نظمیں سندھی نصابی کتابوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں اور ابتک ان نظموں کا کوئی الگ سے مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ مرزا صاحب اگرچہ سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ مگر بہت پیچھے بچپن میں بڑی بڑی انوکھی تراکیب سے اپنے والدین کو ہنساتے اور خوش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر:

> "ایک بار والدین کے سامنے آپ نے فقیرنی کو جب کچھ سکے دیے تو جواباً اس نے دعا دیتے ہوئے کہا۔ سدا سکھی رہو بیٹا۔ سرسبز و شاداب رہو۔ فقیرنی کی اس دعا کے بعد قلیچ بیگ کو ایک شرارت سوجھی اور آپ گھر سے باہر چلے گئے۔ اور درخت کی ہری ٹہنیوں سے خود کو ڈھانپ لیا اور والدین کے سامنے آکھڑے ہوئے، کہنے لگا۔ دیکھیں، "فقیرنی کی دعا کا کتنا جلد مجھ پر اثر ہو گیا ہے۔"

مطلب یہ کہ یہ بھی وہ خوش دلی تھی جو بڑے ہو کر بچوں کے لیے دلچسپ نثر و نظم لکھنے کے سلسلے میں آپ کے کام آئی۔

برطانوی دور میں آپ نے بچوں بڑوں، تعلیم نسواں اور ملا مکتب کے بچوں کے لیے خاصی تعداد میں تعلیمی اور درسی کتابوں کی تصنیف و تدوین میں بھی حصہ لیا۔ بلاشبہ قلیچ کو اپنی اسلامی اقدار اور ماضی سے گہری عقیدت تھی۔ لیکن ماحول کا تقاضا تھا کہ وہ نئے نظام کو بھی خوش آمدید کہیں۔ لہٰذا ابتدائی نصابی اسباق ہوں یا بچوں کے لیے ادبی تحریریں ہوں۔ آپ نے نئے زمانے کے تقاضوں کو بہر حال مدنظر ضرور رکھا ہے۔ ماضی تا حال بچوں کی درسی کتابوں میں قلیچ بیگ کی کئی ایک نظمیں شامل ہیں۔ جنہیں سندھ کے

اطفالی ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان نظموں میں شاعرانہ خوبیوں سے زیادہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ انہیں پڑھ کر طلبہ وطالبات میں محنت سے پڑھنے، وطن سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہو، ان کے اخلاق وعادات درست ہوں اور ذہن قلب پر اچھے اثرات مرتب ہوں۔ آپ کچھ ایسی نظموں اور گیتوں کے چند ٹکڑے یہاں دیکھیے۔

"گلن ۾ گلابي مزيدار گل" (پھولوں میں گلابی مزیدار پھول) "واپار ڪيو واپار ڪيو خود پاڻ نبي ﷺ واپار ڪيو"۔ (بیوپار سے جی لگاؤ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی پیشہ پسند فرماتے تھے)۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں جتنا بیش بہا ذخیرہ نثر ونظم میں قلیچ بیگ نے تخلیق کیا ہے۔ کوئی اور سندھی ادیب اب تک نہ کر سکا ہے۔

پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے حوالے سے آپ تحصیلدار وڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر بچوں کے لیے اپنی تحریر کردہ تخلیقات میں آپ فطرت اطفال کے ماہرِ نفسیات اور عظیم معلم ہی نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں نصاب کمیٹی کے معزز ممبر کے طور پر بھی اپنے فرائض سرانجام دے ہی رہے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے روزمرہ کی دلچسپیوں کو بھی آپ نے نظم کیا ہے۔ ان کی یہ تخلیقات آج تک بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ومعروف ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کی یہ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم:

الاهي ڪرم ڪر اسان تي قراري
آ هيون اصل کان سڀ ڏکيا ۽ ڏوهاري

(بارِالٰہی اپنے کرم سے ہم گنہگاروں پر رحم فرما، ہم تو ازل ہی سے گناہوں میں گھرے ہوئے ہیں)

آمدِ صبح نظم کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

صبح جي چڱي مهل آهي گهڻي
رکي خاصيت ان ۾ خاصي گهڻي

(صبح دم کی خوشگوار ہواؤں کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ ہی ہوائیں تو صحت وتندرسی کی ضمانت ہوتی ہیں)

اساتذہ کا ادب کے موضوع پر یہ شعر دیکھیے۔

اٿو ماءُ ۽ پيُ کان پوءِ چوڪرو
سڀن کان وڏو حق استاد جو

(بچو، والدین کے بعد سب سے بڑا حق جو آپ پر ہے وہ اساتذہ کا ہے گویا والدین کے ساتھ ان کا احترام آپ پر لازم ہے)

ڪرڻ آهي بهتر سين سان ڀلا ئي
چڱي ڳالهه اهڙي نه ئي آهي ڪائي

(سب سے محبت وخلوص سے پیش آنا ہی بہترین اچھائی ہے۔ بچو، اس کام سے بہتر کوئی اور کام تو ہے ہی نہیں)

قلیچ بحیثیت شاعر

ہر عہد کی شاعری کا ایک اجتماعی لب ولہجہ ہوتا ہے، جس میں اس عہد کا اجتماعی شعور، طرزِ معاشرت اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ پائے جاتے ہیں۔ قلیچ بیگ کے عہد میں سندھی شاعری فارسی کے زیرِ اثر، اجتماعی طرزِ اظہار کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی، قلیچ صاحب کے طرزِ اظہار پر یہی رنگ نظر تو آتا ہی ہے مگر یہ طرزِ اظہار آپ کی شاعری کا غالب رنگ نہیں ہے، آپ کی کہی ہوئی موضوعاتی نظمیں، کافیاں، رباعیاں، مزاحیہ شاعری، اشعار خیال منفرد جدید سے آراستہ ہیں، جن میں آپ کا طرزِ نگارش بے شک مصلحانہ و عالمانہ ہے، مگر اندازِ بیاں آسان، اور عام فہم ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ آپ کی زیادہ تر غزلیں فارسی کے زیرِ اثر تھیں اور ان میں فارسی تراکیب اور تشبیہات واستعارے کے اثرات نمایاں تھے، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی غزلیہ شاعری اور رباعیات پر حافظ، سعدی، جامی، خیام، فردوسی کے شاعرانہ کمالات غالب رہے ہیں لیکن غزل کے علاوہ نثر نگاری میں انہوں نے موضوعات کے لحاظ سے، انگریزی ادب کے وسیع مطالعے کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

دورِ قلیچ میں ان کے سب سے اہم ہمعصر شاعر میر عبدالحسن خان سانگی تھے، مگر معیار کے حوالے سے دیکھا جائے تو قلیچ بیگ کی شاعری کبھی بھی سانگی صاحب کی غزلیہ شاعری کے مقابلے میں کم تر درجے کی نہیں ہے۔

یہاں میر سانگی اور قلیچ بیگ کی شاعری کا تقابلی جائزہ مقصود نہیں ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ سانگی صاحب صرف صنفِ غزل اور کافی کی شاعری کو ترجیح دے رہے تھے، مگر قلیچ بیگ، غزل، کافی، رباعی نظمیں، اشعار، سلام، مرثیہ، نوحہ جیسی قدم اصناف پر بھی بہت سنجیدگی سے طبع آزمائی کر رہے تھے، حتیٰ کہ آپ نے ہزلیات نامی مجموعے میں نثری نظم لکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے (جسے میں سندھی شاعری میں ادبی تجربہ شمار کر رہا ہوں) بے شک قلیچ بیگ نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، مگر آپ نے اپنے شاعرانہ شعور کو کہیں بھی آزاد نہ چھوڑا اور کہیں بھی اپنی شاعرانہ ذمہ داری اور مقصدِ شعر میں غافل نظر نہیں آئے، بے مقصد شعر سے آپ کو کوئی سروکار نہ تھا،

''شاعری ذریعہ شعور ہے اور اسے اسی کام کے لیے بروئے کار لانا چاہیے''

قلیچ بیگ کے پیش نظر یہی نظریہ رہا، گویا انسان ذات اور مسلمانانِ برصغیر کی اصلاح کا خیال ہی آپ کا نظریہ شعر تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، قلیچ بیگ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، آپ نے حمد، نعت، منقبت، سوز و سلام، مرثیہ، قصیدے بھی لکھے ہیں اور مثنویاں بھی اور رباعیات مفردات وقطعات نظم و نثری نظم ونظم معریٰ بھی لکھی ہیں، صنف غزل میں تو آپ کا پورا دیوان ہے،'' دیوانِ قلیچ'' علاوہ ازیں دیگر اصناف سخن میں آپ کے شائع شدہ شعری مجموعوں کے نام ہیں:''موتين جي دبلي'' (موتیوں کی ڈبیا) (رباعیات) ''املهہ ماڻڪ''(مفردات) چندن هار(موضوعاتی نظمیں) عجیب جواهر (ترجمہ وطبع زاد جدید نظمیں) سودائے خام (سندھی، اردو، فارسی غزلیں اور کافیاں) هزلیات و مزاحیہ شاعری، تحفہ امامیہ (رثائی کلام اور گلدستہ قلیچ (کلام سے انتخاب)

یہ درست ہے کہ قلیچ بیگ نے'' دیوانِ قلیچ'' میں گل وبلبل،''حسن وعشق'' اور شمع پروانے کے ترانے بھی گائے ہیں، مگر ان موضوعات کو اس زمانے کے شاعروں کے رواج کی حد تک ہی آپ نے برتا ہے، وگرنہ عشقیہ اظہار ہجر وفراق کے فرسودہ قصے اور حسن وعشق کی عشوہ طرازیاں کلام قلیچ میں مشکل ہی سے جگہ پاتی ہیں اور خاص کر غزلیہ شاعری میں تو علمی ادبی، اخلاقی فلسفیانہ، حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات ہی زیادہ تر نظر آتے ہیں۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں۔

فخر دولت تي نہ ڪر اي دل خدا جي واسطي
مال ملڪ ۽ تاج تخت آهن فجا جي واسطي

ترجمہ:

فخر دولت پر نہ کرائے دل خدا کے واسطے
مال ،ملک اورتاج تخت تو جڑ ہیں فساد کے واسطے

قلیچ بیگ کے بقول انہوں نے مختلف اصناف میں دس ہزار سے زیادہ اشعار کہے ہیں اور نزول شاعری سے متعلق اپنی سوانح حیات میں رقم کیا ہے:

''میں نے اکثر صبح کی سیر کے دوران ہی شاعری کی ہے اور دوران چہل قدمی جو خیالات ذہن میں رونما ہوتے تھے انہیں موزوں کرتا رہتا تھا، بعض اوقات رات کو سونے سے قبل یا دوران نیند بھی ایسی کیفیت طاری ہوتی تو سرہانے رکھے ہوئے کاغذ پر شعر لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ علاوہ ازیں دوست احباب کی

فرمائش پر بھی فی البدیہ انہیں لکھ کر دے دیتا ہوں۔"
قلیچ بیگ نے واضح لکھا ہے:
"شاعری میں حکمت و فلسفہ اور رنگ تصوف ہی مجھے زیادہ عزیز و مرغوب ہے۔
لہٰذا آپ کے ان افکار کی روشنی میں دیکھیں گے تو واقعی آپ کی شاعری کا تمام
لب ولہجہ ناصحانہ و صوفیانہ رنگ لیے ہوئے نظر آتا ہے۔"
قلیچ بیگ کی غزلیہ شاعری کے مقدمہ نگار اور آپ کے لائق فرزند، اجمل بیگ مرزا نے لکھا ہے:
"قلیچ بیگ کا تمام کلام "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی عمدہ مثال ہے۔"
اور بقول اجمل بیگ:
"غزلیہ شاعری میں قلیچ بیگ تغزل کی سدرۃ المنتہیٰ پر فائز نظر آتے ہیں۔"
بہر کیف، قلیچ بیگ پر، قدرت کی یہ خاص مہربانی تھی کہ آپ اپنی مادری زبان سندھی کے ساتھ ساتھ انگریزی، فارسی، اردو، عربی، ہندی، ترکی اور بلوچی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے، لہٰذا ان زبانوں میں جانکاری کے باعث جہاں آپ فارسی و عربی کے شعراء سعدی، حافظ، جامی، فردوسی، خیام، بیدل، رومی، غزالی جیسے شعراء و ادبا کا براہِ راست ان کی زبانوں میں مطالعہ کر رہے تھے، وہاں انگریزی ادب سے شیکسپئر، والٹر، کولرج، شیلی، ورڈس ورتھ، کیٹس وغیرہ جیسے شعراء سے بھی براہ راست استفادہ کر رہے تھے۔ اردو میں میر انیس کے کلام سے خصوصی دلچسپی تھی، گویا مغرب و مشرق کے ادب کا مطالعہ آپ کی تخلیقات میں شیر و شکر کی طرح گھلا ہوا تھا، مگر اس مطالعے کے باوجود قلیچ بیگ ذاتی و شاعرانہ زندگی اور نشست و برخاست میں ایک صوفی منش انسان تھے، لہٰذا آپ کی تمام زندگی صاف ستھری، پاک و صاف اور انسانیت کی خدمت میں گزری اور آخری دنوں تک آپ نے جو بھی شاعری کی، اس میں امن و بھلائی محبت و اخلاص، ذات الٰہی کا تذکرہ اور نسلی مت بھید سے نفرت کا اظہار کرتے رہے آپ کے ایک تصوف آمیز شعر کا نثری ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:

"کیوں بازارِ بزمِ جہاں کی سیر کے دوران میں دلبر کو دل
میں چھپائے گھوم رہے ہو، ارے کیسے عاشق ہو تم! کوئی
خیال نہیں تمہیں اپنا، وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم دوسروں کو
تاک رہے ہو۔"

کلام قلیچ میں صوفیانہ لفظوں و استعاروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلیچ بیگ ایک صاحب حال اور تصوف سے والہانہ تعلق رکھنے والی شخصیت تھے اور اس سلسلے میں بقول اجمل بیگ مرزا:
"آپ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، کے صوفیانہ افکار سے خاص طور پر متاثر تھے۔"

قلیچ بیگ نے اپنا یہ کلام اگر چہ آج سے تقریباً سوڈیڑھ سو سال پہلے کہا تھا، مگر آج بھی آپ کے اس کلام کے اکثر اشعار میں تاثیر آفرینی موجود ہے، دیکھا جائے تو سندھی زبان میں ہر سال بے شمار شعری مجموعے آب و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں، اور سندھ میں ایک اندازے کے مطابق ہزاروں نظمیں، غزلیں اور گیت، روزانہ کے حساب سے لکھے جا رہے ہیں لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود شائد ہی کسی شاعر کا شعر زبان زد عام ہونے کا شرف پاتا ہو۔ لیکن ان کے مقابلے میں زمانہ قدیم میں کہی گئی۔ قلیچ بیگ کی شاعری کے اکثر اشعار، آج بھی پڑھیں تو یاد ہو جاتے ہیں، سادگی و پرکاری قلیچ بیگ کی شاعری کا خاصہ ہے اور ان کی شاعری اگر چہ شکوہ و تجمل، گھن گرج اور مصنوعی عشق و معشوقیت سے کوسوں دور ہے، مگر اس کے باوجود کوئی بات ان کی شاعری میں ایسی ہے ضرور، جو اب تک اس کو زندہ و تابندہ اور سرسبز و شاداب رکھے ہوئے ہے۔

قلیچ بیگ سندھی زبان کے رجحان ساز شاعر

زندگی کی ناپائیداری کے تو سب ہی قائل ہیں، عام آدمی کی زندگی تو صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اس کے سینے میں سانس کی دھونکنی چلتی رہتی ہے۔ زندگی کا کچا دھاگا تو ایک ہچکی کا بھی متحمل نہیں ہوتا۔ اُدھر تارِ نفس کی ڈوری ٹوٹی، ادھر سب سلسلے، سب جاہ و حشمت کے کارخانے گویا مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سب محل دو محلے، طبل و علم اور لاؤ لشکر بالآخر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ جو کل تھا وہ آج نہیں رہا، جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔ کسی ذی روح کو حیاتِ دوام کہاں؟ ماسوائے ان حیات پرور نفوس کے جو اپنے پیچھے ایسی لازوال میراثِ علم و دانش چھوڑ جاتے ہیں، جن کی تابانی نہ تو وقت کی گرد سے ماند پڑتی ہے اور نہ جسے موت کے بے مہر سرد ہاتھ فنا کے گھاٹ اتارنے پہ قادر ہوتے ہیں۔ ہزاروں برسوں پر محیط تاریخ کے صفحات میں اور اربوں انسانوں کے اژدھام میں بس صرف چند ہزار صاحبانِ ذی حشم تو ہوتے ہیں جن کے سروں پے شہرت عام اور بقائے دوام کے تاج جگمگاتے ہیں کہ یہی وہ معدودے چند لوگ ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں علم و دانش کی کوئی جوت جلائی تھی۔ سچائی کی کوئی شاخ لگائی تھی جس کے سایے میں تہذیب انسانی کو پھلنے پھولنے کے مواقع نصیب ہوئے تھے۔

ایسے ہی حیات پرور لوگوں میں شمس العلماء قلیچ بیگ کی شخصیت بھی شامل ہے بے شک جسمانی طور پر وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی چھوڑی ہوئی علمی و ادبی میراث ہمیشہ ہمارے درمیان علم و دانش کی روشنی اور حرارت پیدا کرتی رہے گی۔

میرے خیال میں بیسویں صدی میں سندھی ادب نے جن دو تین اہم شخصیات کو جنم دیا، ان میں نثر نگاری کے حوالے سے مرزا قلیچ بیگ اور شاعری میں شیخ ایاز کا نام زبانِ زدعام ہوا ہے۔ نقادوں نے مرزا صاحب کی ان گنت نثری تحریروں کے حوالے سے اگر انھیں نثر کا شاہ لطیف قرار دیا ہے تو یہ بات کوئی ایسی بے بنیاد بھی نہیں کہ شاہ لطیف جیسے عظیم الشان شاعر کے بعد سندھی نثر نگاری کے لیے مرزا قلیچ بیگ جیسے جوہر قابل ہی کی آرزو کی جاسکتی تھی یہ دراصل سندھ کا ایک تہذیبی خواب تھا جو مرزا قلیچ بیگ کی صورت میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ اگر چہ مرزا صاحب کی نثری تحریروں کے مقابلے میں ان کے ان گنت شعری سرمایہ کی اتنی زیادہ قدر و قیمت و منزلت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔

ان کے ذخیرۂ شعر کو مقدار اور معیار کے حوالے سے کئی اعتبار سے قابل فخر سمجھنا چاہیے کہ جو دو دو مصرعوں کے مطابق اندازاً دس ہزار کے ہے۔ اور یہ اشعار جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً دیوان قليچ، چندن هار، املهه ماڻڪ، موتين جي دهلي، گلدسته قليچ وغیرہ ان کے علاوہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرہ شعر کی مقدار اس کے سوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈائمنڈ (ہیرے) کی زیادہ سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ اس سے جس طرف سے بھی دیکھا جائے تو وہ ڈائمنڈ ہی نظر آئے گا۔ بلاشبہ مرزا صاحب سندھ کی معدنی کان سے برآمد ہونے والا ایسا بے مثال ہیرا ہے جس میں ہر پہلو سے علم و دانش کی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ اور کیا شاعری اور کیا قصے کہانیاں، ان کی ہر تحریر مقصدیت کے جوہر سے تاب ناک ہے۔ اور اسے مقبولیت، چمک دمک اور بقائے دوام حاصل ہے۔ جدید سندھی شاعری کے میرِ کارواں تنویر عباسی نے درست کہا ہے کہ سندھی شاعری چند مستثنیات کے سوا شروع ہی سے گھٹنوں کے بل چلتی رہی ہے۔ اور صدیوں کے بعد اس میں چند معمولی تبدیلیوں کے آثار پیدا ہوئے۔ مگر گذشتہ صدی اور موجودہ صدی نے دو نہایت اہم کارنامے پیش کیے ہیں۔ جن میں سرِفہرست بچل سرمست اور خلیفہ گل محمد کی شاعری ہے جو گذشتہ صدی کے دوران ظہور پذیر ہوئی۔ انھوں نے سندھی غزل کو فارسی اوزان سے روشناس کرایا۔ اور دوسرا اہم واقعہ مرزا قلیچ بیگ کی شاعری ہے، جس نے نظم کے ذریعے مغربی رجحانوں کو سندھی زبان میں تعارف کرانے کی ہر ممکن سعی کی ہے ان کے بعد عہد کی دوسری اہم شاعری، بہر شیخ ایاز، نارائن شیام اور ہری دلگیر کی شاعری کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

دراصل مرزا صاحب نے سات آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد فریدون بیگ مرزا اور نانا خسرو بیگ مرزا کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ جو ہر مرتبہ خوش ہو کر بطور داد و ہمت افزائی کے طور پر ان کو انعام میں پستہ، بادام اور کشمش دیتے تھے۔ انہوں نے 1870ء کے لگ بھگ سندھی اور فارسی میں بچوں کے لیے اپنی شاعری کا مجموعہ مرتب کیا، اس وقت ان کی عمر صرف 17 برس کی تھی، بقول مرزا صاحب اس دور میں سندھی شعر جن دو اقسام میں لکھا جاتا تھا، ان میں سے ایک قدیم خالص سندھی کے نہج یعنی ابیات اور

کافیوں کی صورت میں شاہ لطیف کے تتبع اور تقلید میں، اور دوسرے فارسی شاعری کے اندازِ سخن پر۔ یعنی قصیدہ جات، مثنویات، غزلیات وغیرہ کے انداز میں۔ اس اندازِ سخن کے نمائندے سید ثابت علی شاہ تھے۔ ان دونوں اقسام کی شاعری کا موجد اس دور میں انہی دونوں صاحبان کو مانا گیا۔ یعنی شاہ لطیف بھٹائی اور سید ثابت علی شاہ سیوستانی۔ 1887ء میں جب مرزا صاحب 25 برس کے گھبرو ترک زادے اور حسین نوجوان تھے اور تعلقہ نصیر آباد میں مختارکار کے عہدے پر فائز تھے۔ اس دور کے بارے میں آپ نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

''جوانی کی مستی میں شاعری کے خیال آنے لگے۔ اور اسی دور میں مجھے کافیاں لکھنے کا شوق ہوا۔ جو مقامی فنکار گاتے تھے۔ بعد ازاں ضلع شکارپور میں میری یہ کافیاں اور غزلیات بہت زیادہ مشہور بھی ہوئیں۔ اور ہر جگہ گائی جانے لگیں۔''

سال 1910ء میں شائع شدہ مجموعہ کلام ''سودائے خام'' میں جمع شدہ شاعری کلاسیکل رنگ میں رنگی ہوئی اور موسیقی کی خوشبو میں گوندھی ہوئی ہے۔ آپ کی ان کافیوں میں یقیناً آج بھی تازہ کارانہ کشش موجود ہے۔ اور آج بھی سندھ کے خوش گلو فنکار اپنی کھنکتی مترنم آواز میں جب ان کافیوں کو گاتے ہیں تو ان کے تاثر سے ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر۔

جنهن جي سُو ر وڏي دل سٽي سٽي
تنهن کي صبر اچي ڪيئن يار ري

☆☆☆☆

ترجمہ:

دردِ عشق نے میرا جگر چھلنی کر دیا ہے
جس کا یار بچھڑ جائے
اسے صبر و سکون نصیب کہاں

تيو قليچ فراق ۾ فاني
جان جلا يائين تو لاءِ جاني
گهار تنهن سان ڏينهن ٻني ٻني
جنهن جي سور وڏي دل سٽي سٽي

ترجمہ:

وہ جو تیرے لیے اپنی جان جلا رہا ہے

آ، دو چار دن اسے اپنا دیدار عطا کر

عظیم گائک استاد محمد جمن کی آواز میں فنا کے احساس سے لبریز مندرجہ ذیل یہ کافی تو بہت ہی مقبول ہوئی:

کرڙيان دنيا آهي فاني
ڪنهن سان نه نباهي جاني

ترجمہ:

یہ دنیا فانی ہے دوستو
اور یہ کسی کے ساتھ بھی وفا نہیں کرتی

آپ کی غزل نما یہ کافیاں دیکھیں:

دنيا ۾ دل جو مطلب پورو ٿيو ته ڇا ٿيو
آخر مليو نه جي رب رهيو سڀ مليو ته ڇا ٿيو

ترجمہ:

دنیا میں دل کے سب مطلب پورے ہو بھی جائیں تو کیا ہوا
اگر قربت رب ہی حاصل نہ ہو تو پھر جینے کا مزا کیا

دل آ هه عاقلن لء هڪڙو حساب خانو
پر آهه عاشقن لء ,هڪڙو ڪباب خانو

ترجمہ:

غافلوں کے لیے یہ دل حساب خانہ ہے
اور عاشقوں کے لیے ایک کباب خانہ

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ قلیچ بیگ اپنی سرشت میں ترک زادہ تھے اور آپ کے نانا خسرو بیگ اور والد فریدون بیگ مرزا ترکی زبان بولتے تھے۔ سندھ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد ان دونوں صاحبان نے سندھی اور سرائیکی زبان سے عمدہ واقفیت بھی حاصل کر لی تھی لیکن بقول مرزا صاحب وہ اکثر و بیشتر مونث و مذکر میں فرق محسوس نہیں کر پاتے تھے۔ جب کہ مرزا قلیچ بیگ کو ایسی کوئی دشواری پیش نہ آئی کیوں کہ انھوں نے جس گود میں پرورش پائی تھی وہ سندھ ہی کی مٹی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی

والدہ اگرچہ مرز خسرو بیگ کی دختر تھی، لیکن ان کا ننھیال جلبانی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خانوادہ صدیوں سے سندھ کی ہواؤں اور خوشبوؤں میں سانس لے رہا تھا۔ اور جلبانی خاندان باقاعدہ سے سرائیکی اور خالص سندھی زبان بولتا تھا۔ مرزا صاحب کے والد محترم فریدون بیگ مرزا موسیقی کے بھی رسیا تھے اور سرندا (چوتارا) بجانا خوب جانتے تھے بقول مرزا صاحب، ان کے بھائی بھی بہت ہی خوش گلو تھے اور مرزا قلیچ بیگ خود بھی کافیاں کہنے کے ساتھ ساتھ ستار بجانے کا شوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب نے برصغیر کی کلاسیکی موسیقی اور سندھ کی مقامی شاعری کی ہئیت سے اپنے والہانہ لگاؤ کے باعث جو شاہکار کافیاں تحریر کیں وہ نوجوان قلیچ کی شگفتہ روح کا حسین ترین اظہار کر رہی تھیں۔ جیسا کہ یہ بات واضح ہے کہ اس دور کی شاعری، فارسی شاعری کی ہئیتوں اور عروض کی حدود میں رائج تھی، لیکن قلیچ کی کافی کا رنگ، خالص سندھی شاعری کا رنگ لیے ہوئے تھی۔

ٿيا سوين سڪندر دارا

جن جوڙيا تخت هزارا

وه واه وڃائي وارا

سڀ خان چڏي ويا خاني

ترجمہ:

یہاں سینکڑوں سکندر و دارا پیدا ہوئے سب نے یہاں

محلات کھڑے کئے۔ مگر اپنی باری آنے پر وہ سب

یہاں دھرے کے دھرے رہ گئے

هت نبي ولي ,لک آيا

جي عرب عجم نت ڳايا

سي گهوٽ اجل سڀ گهايا

سي سورهيه سڀ سلطاني

ڪرڏيان دنيا آهي فاني

ترجمہ:

دنیا میں لاکھوں نبی ،ولی تشریف لائے

جنہیں عرب وعجم میں بڑی عزت وتکریم نصیب ہوئی

مگر وہ بھی اجل سے بچ نہ سکے

سوچو کہ دنیا بالآخر فانی ہے

تنهنجي سهڻي سجڻ تصوير ڏسي ,تڪبير چوان

سور قليچ سيئي سهه سرتي

ڪهڙي آئون تقدير آڳيان تدبير چوان

زلف سياه سراسر خم خم

رهزن سي رهگير ظالم زنجير چوان

تنهنجي سهڻي سجڻ تصوير ڏسي ,تڪبير چوان

ترجمہ:

تیری حسین صورت کو دیکھ کر میں تکبیر پڑھ رہا ہوں

اے قلیچ تمام تکالیف کا بار سر پہ سے لے کہ

تقدیر کے سامنے کیا تدبیر کروں

ماٺا ڪري نه مار ,سڄڻ تون ذري ذري

پاٺان نه ڪر تون مون کي پيارا پري پري

مون ڪيو ڪُسڻ قبول,مگر تون ڪو قياس ڪر

خنجر وهاء حلق تي , قاتل هري هري

ترجمہ:

اپنے ناز و ادا کے ساتھ مجھے بار بار

ہلاک نہ کر، مجھے اپنے آپ سے یوں دور نہ رکھ

یہ درست ہے کہ میں نے ذبح ہونا قبول کر لیا ہے مگر،

تو بھی تھوڑا سا تو قیاس کر اور میرے حلق پر خنجر آہستہ آہستہ پھیر

گویا مرزا صاحب نے اپنی شاعری میں اس دور کی مروج دونوں ہیئتوں یعنی لوک کلاسیکل اور روایتی عروض ہیئتوں کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب کی کتاب "املھ ماڻڪ" (املھ مانک) میں درج شدہ ان کے مفردات میں سے صرف ایک بیت مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ جو ہر لحاظ سے مکمل سندھی کلاسیکل رنگ سے لبریز ہے۔

حُسن هوت پنهونءَ جو جيڏيون ڏسو جي

ڳوڙها ڳلن ڳاڙيو ,حال منهنجي تي
ڪني ڪنين ڪري ,لڪيو لوڙڻ آهيو

ترجمہ:

اے سکھیو، اگر تم میرے ساجن کا حسن و جمال دیکھ لوتو تمہیں احساس ہو جائے گا، کہ میں اس کے ہجر و فراق میں کیوں تڑپ رہی ہوں۔

عورت کے لہجے اور زبان میں اپنے محبوب کے حسن اور ہجر و فراق کو بیان کرنے کی یہ روایت، غالباً مرزا صاحب نے برصغیر کی ہندی اور سندھی لوک کلاسیکل شاعری سے ہی اخذ کی ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری میں تو عاشق بھی مرد ہوتا ہے اور معشوق بھی مرد۔ یہاں تک کہ حافظ جیسے غزل گو شاعر اور سعدی کا محبوب بھی مرد (لڑکا) ہے۔ لیکن اس کے برعکس مرزا صاحب سندھی شاعری کے علاوہ اپنی اردو میں کہی گئی شاعری میں بھی اس دور کی ماڈرن عورت کو محبوب کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ اگر چہ ان کے لہجے میں مزاح کی فراوانی کچھ زیادہ ہے۔

دیکھو دیکھو ناز ادا سے پیاری میڈم آتی ہے
دور سے اپنا ھینڈ اٹھا کر مجھ کو ادھر بلاتی ہے
جب میں سیڈ اور سائلینٹ بیٹھوں
ماؤتھ سے ماؤتھ لگاتی ہے
لافنگ لافنگ بڑے مزے سے
پیانو فوراً بجاتی ہے

برصغیر میں، انگریزوں نے انیسویں صدی کے وسط میں جب سندھ پر اپنا تسلط قائم کیا تو ان کے ساتھ یورپ کی شاعری اور ادب کا سندھ میں داخل ہونا، ایک فطری بات تھی، لیکن 1853ء میں جب سندھی زبان کا جدید رسم الخط معرضِ وجود میں آیا، تو سندھی زبان کی ترقی و ترویج میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔

سندھ کا یہ (انگریزوں کا) دور دراصل عروضی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ اور یہاں کا فارسی زدہ غزل گو شاعر، محفلِ سخن میں واہ واہ اور مرحبا مرحبا کی داد پر محوِ سخن تھا۔ میر عبدالحسین خان سانگی، قاسم، فاضل، گدا اور لیلا رام خاکی اس دور میں مرزا قلیچ بیگ کے اہم معاصروں میں شامل تھے۔ اور شدید روایت پسند شاعر تھے۔

ان سب میں اگر چہ سانگی، سندھی غزل کے بادشاہ گردانے گئے، مگر پھر بھی ان سب ہم عصروں میں جدت طرازی اور طباعی کے لحاظ سے مرزا قلیچ بیگ کو خصوصی اہمیت اور اعزاز حاصل تھا۔

اس دور میں بھی پڑھے لکھے شاعروں اور صاحبانِ علم وفضل کی اکثریت یقیناً رہی ہوگی لیکن مرزا صاحب نے اس ماحول میں بھی خود کو ہر لحاظ سے جدید اندازِ فکر اور نئی طرزِ ادا کے نمائندے کی حیثیت سے تسلیم کروایا۔ وہ ماضی سے زیادہ مستقبل پسند شخص تھے۔ اور یہ خوبی ان کے معاصروں میں سے کسی اور کے نصیب میں نہ آئی تھی۔

''آوار'' زبان کے روسی شاعر ''رسول حمزہ توف'' کا شعر ہے، کہ مچھلی مخالف سمت سے چلتی ہے۔ چڑیا بھی پرواز کرتے ہوئے ہوا کے سامنے کی سمت سے مدِ مقابل ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اپنے دور کے بیدار اور ذہین مصنفین بھی ہمیشہ روایتوں کے طوفانوں میں اسی طرح قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ شاہ لطیفؒ نے بھی خوب فرمایا ہے:

لهووار و لوڪ وهي

تون اُوچو وهه اويار

اگرچہ قلیچ روایت پسند بھی تھے، مگر آپ کی شاعری کا انفرادی لہجہ اس دور کے شعراء کے مروجہ لہجے سے قطعی مختلف بھی تھا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ روایتی لہجہ بھی انہیں عزیز تھا۔ مگر ان کی نگاہ مستقبل پر تھی، اور انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے جدید رویوں کی طرف زیادہ دھیان دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی سخن وری کی رفتار کو بھی آگے بڑھایا۔ اور جدید طرزِ سخن کے ساتھ ساتھ قدیم اصنافِ سخن مثلاً غزل، قطعہ، مسدس اور مخمس وغیرہ میں بھی آپ نے خوب منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر کے طور پر خود کو منوایا۔ گویا اگر مرزا صاحب کے معاصر روایتی راستوں پر چل رہے تھے تو آپ نے خود کو نئی گزرگاہ کا مسافر جانا۔ تعجب خیز حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس قلم تو ایک ہی تھا۔ لیکن اس کے توسط سے ان میں متعدد اصنافِ سخن لکھنے کی بھرپور قوت موجود تھی۔ یعنی ڈرامہ، ناول، افسانہ، لغت، بچوں کا ادب، صرف ونحو، تاریخ، تحقیق، لطیف شناسی، زراعت، خوشہ چینی، مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری وغیرہ۔ ایسی تنوع صفات شخصیتیں کو دیکھا جائے تو تاریخ میں کم کم ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔

خصوصاً نثر کے ساتھ شاعری کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرنے کے لیے قدرت نے انہیں اعلیٰ دماغ عطا کیا تھا۔ جسے استعمال کرنے کے لیے انہوں نے متعدد راہیں بھی تلاش کیں۔ جہاں شاعری میں انھوں نے اپنا اسلوب خاص نکالا تھا وہیں مترجم کی حیثیت سے انھوں نے مغرب ومشرق کے جدید رجحانات کو سندھی زبان کے خمیر میں گوندھ کر نثر نگاری کے نئے انداز بھی تراشے ہیں اور یہ سب کام وہ جدت طرازی کے شوق میں نہیں کرتے تھے، بلکہ اس خیال سے کہ ان کا قلم رواں دواں رہے، تاکہ مستقبل میں موضوعات کی سطح پر سندھی شاعری کا چراغ اور بھی زیادہ تابناک نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ کسان بیج بونے سے پہلے زمین کی زرخیزی سے باخبر ہوتا ہے۔ اور آم کی گٹھلی کو وہ کسی طرح بھی بنجر زمین میں لگانا پسند

نہیں کرتا، بس اسی طرح مرزا صاحب نے بھی سندھی زبان کے سبھاؤ کو وسعت دیتے ہوئے، اس میں زندہ جاوید نثری اور شعری اصناف کے بیج بو کر، اس کی آبیاری تادمِ آخر اپنے قلم سے جاری رکھی جس کا پھل آج کی نسل کھا رہی ہے۔

1880ء میں مرزا صاحب جب ستائیس برس کے تھے، تو انہوں نے سندھی میں پہلا منظوم (Opera Drama) ''لیلیٰ مجنوں'' لکھا تھا۔ اس سے پہلے سندھی منظوم ڈرامے کی روایت کا کوئی وجود تک نہ تھا، 1887ء میں اسی طرح انہوں نے بچوں کی تفریح اور مطالعہ کی غرض سے ''قصو هرتي جو'' منظوم لکھا، جسے بچوں کے ادب کے حوالے سے آج بھی لافانی شہرت حاصل ہے۔ ایسی ہی کچھ بے مثال وشگفتہ نظموں کا انتخاب ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

گلن ۾ گلابي مزيدار گل
چنبيلي ۽ موتئي جو مهندار گل

کوڏ رکڻ تون کوڏر يار
کوڏر آهه عجب اوزار

واپار ڪريو واپار ڪريو
خود پاڻ نبيءُ واپار ڪيو

پھولوں میں ، گلاب کا پھول بہت مزیدار پھول ہے
یہ چنبیلی وموتیا سے بھی زیادہ عطر بیز ہے اے محنت کش ساتھی، تو
بھی پھاوڑے کو اپنا ساتھی بنا، یہ ایک بہت ہی موثر اوزار ہے
بیوپار کرو، بیوپار کرو
خود نبیؐ نے بھی بیوپار کیا ہے

سازوں کی دھنوں اور آوازوں کے متعلق آپ کے مندرجہ ذیل لطیف اشعار پیش خدمت ہیں:

لغارو چوي تو تہ وذيرج پڪڙ
تڪڙ چڏ،تڪڙ چڏ تڪڙ چڏ،تڪڙ

ٿاڏُ ڪڙ ۽ طبلا وڄن ۾ چون
تہ ڏڪ ڏڪ ٿا ڏڪ اسان کي لڳن

ترجمہ:

نقارہ کہہ رہا ہے کہ دھیرج پکڑ اور جلد بازی چھوڑ
یہ طبلے اور پکھراج بجنے کے دوران میں کہتے ہیں
کہ ہمیں بہت چوٹیں لگ رہی ہیں

مرزا صاحب نے 47 برس کی عمر میں 1900ء میں عمر خیام کے فارسی رباعیات کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ اور جس دور میں مرزا صاحب نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کیا، تو اس دور میں برصغیر کی دیگر زبانوں میں نہ تو ان رباعیات کا ترجمہ ہوا تھا، اور نہ ہی انہیں کسی اور شاعر نے ترجمہ کرنے کی سعی کی تھی۔ البتہ یورپ کی متعدد زبانوں میں کچھ منتخب رباعیات کے تراجم ہو چکے تھے۔ سندھی زبان کے لیے یہ رباعیات کا تجربہ بالکل اسی طرح تھا، جس طرح شیخ ایاز، نارائن شیام اور تنویر عباسی نے جاپانی صنف ہائیکو کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور بعد میں شیخ ایاز نے ہائیکو کے متعلق ایک مکمل کتاب ''مینھن کٹیون'' تصنیف کی۔

مرزا صاحب نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کرنے کے بعد 1914ء میں خود اپنی طبع زاد رباعیات کا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔

اور اس کا نام ''موتين جي دبلي '' (موتین جی دبلی) رکھا۔ عہدِ جدید کے عظیم سندھی شاعر نارائن شیام کی 1955ء میں شائع شدہ رباعیات کے پہلے مجموعے ''پنکڙيون '' (پنکڑیوں) کو مرزا صاحب کی رباعیات ہی کے سلسلے کی کڑی سمجھنا چاہیے۔

مرزا صاحب کی خالص سندھی لہجے میں ایک رباعی پیش ہے۔

پهراڻ جي بار کان ڪري آئون ٿو پوان
آواز جي واءُ سان ڪري آئون ٿو پوان
منهنجو ٿي ڪريو پاڇو اڳي ڌرتيءَ تي
هاڻ ضعف کان پاڇي جان ڪري آئونُ ٿو پوان

ترجمہ:

میں اتنا نحیف ہوں کہ ''کُرتے'' کے بوجھ سے گر پڑتا ہوں
آواز کی ہوا سے ڈھ جاتا ہوں پہلے تو میرا سایہ زمین پر گرتا تھا،
اب ضعف سے، میں خود سائے کی طرح زمین پر گر پڑتا ہوں

مرزا صاحب نے اپنی ایک کتاب ''عجيب جواهر'' میں یورپ کی جدید شاعری کو سندھی جامہ پہنایا ہے اور اس میں خیال کی وسعت پیدا کی ہے، ''عجيب جواهر'' (عجیب جواہر) میں انہوں نے یورپ کی جدید شاعری کے نمونوں کو سندھی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں جن شعراء کی

نظمیں شامل کی گئی ہیں، ان میں شیکسپیئر، لارڈ بائرن، کالرج، کیٹس، ورڈ سورتھ، والٹر اسکاٹ، ٹینی سن اور ایلیٹ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ایلیٹ کے ایک خوبصورت خیال کو قلیچ بیگ نے سندھی کا جامہ اس طرح پہنایا ہے۔ جس کو پڑھتے ہوئے اصل کا گمان ہوتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''ننڍڙيون شيون'' (چھوٹی اشیاء)

ننڍڙا پل ڏينهن رات بنائن

ننڍڙا خيال ڪتاب

ننڍڙا ٻج درخت اُپائن

ننڍڙا ڦڙا اسيلاب

ننڍڙيون چڻنگون باهيون ٺاهن

ننڍڙيون ذريون پهڻ

ننڍڙيون ٻوليون راڳ تيون ٺاهن

ننڍڙيون چيليون ڏڻ

ننڍڙو تحفو دوست سچي جو

نت ٿوجني جياري

ننڍڙو لفظ منهان جونڪري

ٺاري تويا ماري

ترجمہ: چھوٹے چھوٹے پل، دن رات تخلیق کرتے ہیں

چھوٹے خیال کتاب

ننھے ننھے بیج، بڑے بڑے درخت اُگاتے ہیں

اور ننھی بوندیں سیلاب

چھوٹے چھوٹے انگارے آگ سلگاتے ہیں

اور کنکریاں پہاڑ

چھوٹے چھوٹے سُر راگ بناتے ہیں

اور چھوٹی چھوٹی میمنیاں ریوڑ

دوست کو دوست کا تحفہ

اسے نئی زندگی عطا کر دیتا ہے

اور منہ سے نکالا

چھوٹا سا لفظ

کبھی دکھ کا سبب بنتا ہے تو کبھی سکھ کا

بقول مرزا اسد بیگ:

''قلیچ بیگ کی شاعری، موضوعاتی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انسانی زندگی میں مہد سے لحد تک اسے متعدد حالات و کیفیات سے گزرنا ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہمیں اس طرح کی ہر کیفیت اور موضوع پر مرزا صاحب کے کلام میں ایک ایک دو دو شعر ضرور مل جاتے ہیں۔ اور ان میں کہیں ان کی طبع زاد شاعری ہے تو کہیں ترجمے۔ گویا مرزا صاحب نے رنگ برنگی پھولوں کی مہک سے سندھی زبان کو مہکا دیا ہے۔''

مرزا صاحب کے نقادوں میں سے ان کے منجھلے فرزند مرزا اجمل بیگ کا ان کی ترجمہ شدہ شاعری کے متعلق خیال ہے:

''مرزا صاحب اخذ کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے ادب کے بنیادی خیال کو اخذ کر کے اپنے رنگ میں اس طرح ڈھالتے تھے کہ کسی قسم کا فرق محسوس نہیں ہوتا تھا اور ترجمہ بھی طبع زاد تخلیق محسوس ہونے لگتا تھا۔''

مرزا صاحب خود بھی اپنے اس تخلیقی عمل کے متعلق کہتے ہیں:

موتي مضمون جاڪيدان گهولي

شعر جي بحر جو آهيان غواص

ترجمہ:

میں مثل موتی نئے مضامین ڈھونڈتا ہوں

شعر کے بحر کا میں غواص ہوں

خود اپنے اشعار کی تحریری ساخت و بناوٹ کو انتہائی تخلیقی انداز میں اس طرح سے منظوم کرتے ہیں۔

ڏيان ڏئي منهنجي شعر سازي ڏس

سنهڙي ڏاڳي تي ترڪ تازي ڏس

ڪيئن آئون ڪورئيڙي وانگي ڊوڙان ٿو

تارتي بيهي راند ڪيڏان ٿو

ترجمہ:

دھیان سے میری شعر سازی کو دیکھو ، گویا
باریک دھاگے پر میرا فن دیکھو ، مثل
مکڑی کے میں اس پہ دوڑتا ہوں
اور تار پر چلتے ، اس پر کھڑا ہو جاتا ہوں

مجھے یہاں یہ انکشاف کرتے ہوئے بھی مسرت ہورہی ہے کہ سندھی زبان میں نثری نظم جیسی جدید ترین صنف کے موجد بھی مرزا قلیچ بیگ صاحب ہی ہیں۔ انہوں نے یہ صنف، سندھ میں اس دور میں متعارف کرائی، جب 1898ء میں آپ تھرپارکر میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ نثری نظم آپ کے غیر مطبوعہ شعری مجموعے "ہزلیات" میں موجود ہے۔ جو آپ نے 1929ء میں خود مرتب کی۔

بقول شمشیر الحیدری صاحب:

"سندھی میں پہلی نثری نظم 1937ء میں سوبھراج نرملداس فانی نے لکھی تھی جو سندھو میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں شیخ راز، شیخ ایاز اور نارائن شیام نے اس صنف کو باقاعدہ سندھی میں مقبول بنایا، تاج جویو کی تحریر کے مطابق ٹیگور کے گیتانجلی کے سندھی ترجمے کے بعد 1920ء تا 1940ء نثری نظم سندھی زبان میں باقاعدہ لکھی گئی۔ جبکہ مرزا صاحب نے یہی صنف 1898ء میں تھر کے شہر مٹھی میں قیام کے دوران لکھی تھی، خیال ہے کہ نثری نظمیں انہوں نے فرانس کے عظیم شعراء بودلیر، رامبو، میلارمی اور سینٹ جاں پرس کی نثری نظموں سے متاثر ہو کر کہی تھی، یہاں مجھے یقین ہے کہ اس مذکورہ مجموعے کلام "ہزلیات" کی اشاعت کے بعد ہم سندھی زبان میں نثری نظم کی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔ یہ نظم سوا سو برس پہلے لکھی گئی تھی، لیکن آج بھی تر و تازہ اور خیال انگیز ہے۔ نظم کا عنوان ہے "مٺي"۔"

مٺي

مٺي جي شهر ۾ مونکي ملي
هڪ زال ، هو جنهن جوناڻُ مِٺي
هئي سندس ذات مٺي
لاتِ مٺي

بات مٺي

وٺي اُت ٻانهن مستيءَ ۾

ڏني مانس چين تي چاه مان

سئووار مٺي

چيو مانس :اي مٺي !

تون اهڙي مٺي

جو مٺي مصري ۾ اهڙي ناهي مٺي

چيائين ! چڏ منا قليچ چڏ !

مٺيوي پيون

آئون مٺي آهيان

ناهيان مٺي

ترجمہ:

''مٹھی''،جواک شہر ہے

وہاں مجھے

ایک عورت ملی

بڑی میٹھی تھی اس کی ذات

بات

آواز

اچانک میں نے اس کا بازو پکڑ کر

اسے پیار کیا

اور کہا، اے میٹھی!!

تو ہے ایسی میٹھی

کہ،شیر وشکر نبات بھی تیرے سامنے

کچھ نہیں

بولی

چھوڑ میرا بازو چھوڑ قلیچ!
میٹھی ہوگی کوئی اور
میں تو مُٹھی (بدنصیب) ہوں
نہ کہ میٹھی!

مرزا صاحب کا شعری ذخیرہ کم و بیش دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو انتیس 29 شعری مجموعات میں مرتب کیا گیا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کے کلام میں جو تنوع اور رنگا رنگی ہے وہ ان کے ہم عصروں میں بھی کم کم دیکھنے میں آتی ہے اگر چہ ان میں سے اکثر شعروں پر اخلاقیات کی مہر ثبت ہے۔ اور یہ دل کی زبان (بھاشا) میں بہت کم لکھی گئی ہے، اور وہ شاید اس لیے بھی ہے کہ شاعری کے حوالے سے آپ مقصدیت کے قائل تھے اور شاعری کو اخلاقی اقدار کا اظہار تصور کرتے تھے۔

آپ کے نزدیک شعر لکھنا محض تسکینِ ذوق کا نام نہ تھا۔ بلکہ ان کے نزدیک شعر کو زندگی کا ترجمان اور کسی ایسے صحت مند پیغام کا حامل ہونا چاہیے۔ جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ حاصل ہو۔ اور جس سے قوم و ملت کے اخلاق کی تعمیر ممکن ہو سکے۔ مرزا صاحب کا نظریۂ شعر مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہو جاتا ہے۔

ڇڏي جيئن نامور ويا پنهنجو نالو
ڪريون تن جان اسين پڻ اڄ ڪشالو

وٺون موٽي جڏهن رستو رباني
ڇڏيون ڪا پاڻ پوين لئي نشاني

ته من ڪورهگزر ان ڏي نهاري
لنگهي هن رُڃ منهنجان پهچي ڪناري!

ترجمہ:

نامور شخصیات، جس طرح اپنے پیچھے اپنا نیک نام چھوڑ جاتی ہیں
ہمیں بھی ویسے اپنا نام و کام دنیا میں چھوڑ جانا چاہیے
کہ جب راہ ربانی لے کر دنیا سے رخصت ہو جائیں
تو ہماری ان چھوڑی ہوئی نشانیوں کے عوض
آئندہ نسل، نہ فقط ان اچھائیوں کو اپنائے
مگر یہ دنیا جو ایک صحرا کے مثل ہے
کامیابی کے ساتھ وہ اس کو، پار بھی کرے

نوحہ اردو

کر کے بین سکینہ بی بی رو دے زار و زار واویلا
ہے اصغر ہے۔ ہے علی اصغر، ہوں تجھ پہ نثار واویلا

کیسا ہائے کروں میں پیار سے اب تیرا دیدار
مر گیا تو اور جیتی ہوں میں بھیا اب لاچار واویلا

تیر لگایا حلق میں تیرے حرملہ بدکردار
پیاس بجھی پیکان سے تیرے بھوک گئی یکبار واویلا

ست نڈھال ہے سانس اٹھا کچھ کہہ جانی ہشیار
بہن سے کہہ تو کر کے اشارا کیسا ہے آزار واویلا

تشنہ دہن اور خشک زباں تو قتل ہوا دلدار
مرے کلیجی پر یہ دیکھ کے ہو گئے زخم ہزار واویلا

جھولا دیکھ کے خالی ہوئے ہم سب دل افگار
بال جھنڈولے دیکھ کے جاتا دل سے صبر و کردار واویلا

کھول کے آنکھیں دیکھ رہا ہے کرتا کیوں نہیں پیار
کھول تو منہ اور بول زباں سے پیارا کر گفتار واویلا

لوریاں دے کے کس کو سلاؤں ہو کے شب بیدار
گود میں لے کر کھیلوں کس سے درد کروں اظہار واویلا

روٹھے ہو کیوں ہم سے بھائی ہو گئے کیوں بیزار
ہو کے طفل شہیدوں میں بھی آخر ہوا شمار واویلا

میرا بھی اور اماں کا بھی جاتا ہے غم خوار
ساتھ ہمارے رہ علی اصغر اور بھی دن دو چار واویلا

ہے ہے قتل ہوا علی اکبر بھائی گل رخسار
تو بھی جاتا چھوٹا بچہ چھوڑ کے یہ گھر بار واویلا

ہو گیا قاسم نوشہ بھائی قتل بمعہ دستار
جانِ چچا عباس علی پر ٹوٹ پڑی کفار واویلا

بھائی عابد کب سے پڑے ہیں بستر پر بیمار
بابا جان بھی ہوئے ہر دم مرنے کو تیار واویلا

تھا قسمت میں سب کے ہے ہے تیر وتبر تلوار
بس نہ ہمارا چلتا کوئی ہیں سب بے اختیار واویلا

کان سے میرے اب چھینیں گے گوہر ستم شعار
ڈرتی ہوں میں شمر و عمر سے ہیں وہ بد اطوار واویلا

آگ لگا کر ہائے کریں گے خیمے سب مسمار
مال و متاع سب ہی لوٹیں گے یہ کوفی غدار واویلا

اصغر تیرے غم میں میرا جینا ہے دشوار
مولیٰ تیرے ساتھ ملا دے بھائی برخوردار واویلا

دل سے قلیچؔ ہے رہتا ہر دم تیرا ماتم دار
پنج تن اس کے حامی ہوں گے اور عترت اطہار واویلا

نوحہ

ہائے ہائے شاہ حسینا
ہائے مظلوم حسینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
ہائے ہائے نورالعینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
ہائے سید کونینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
جگ کا زیب اور زینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
حوریں کرتی ہیں بینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
کھولی ہیں زلفینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
تجھ بن دل کو نہ چینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
ہر سو شور اور شینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
زار روئیں دن رینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
تر ہیں سب کے نیناں
ہائے ہائے شاہ حسینا
تیرا غم ہائے دینا
ہائے ہائے شاہ حسینا
سن تو قلیچ کی سینا

نوحه

فرس فہمیدہ بر دعوت اشقیا
آمدی از مدینہ بدشتِ بلا
باہمہ آل و اطہر شدی مبتلا
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

برسرت شیر عباس، قرباں شدہ
قاسم نوجوانوں نیز بے جاں شدہ
عون و جعفر شریک شہیداں شدہ
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

اکبر و اصغرت بر تو گشتہ فدا
عابدت نیز گشتہ اسیر بلا
ہمہ خورد وکلاں شد سراز تن جدا
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

ماندی آخر تو تنہا دگر دی وغا
ہم نمودی تو بروعدہ خود وفا
شمر ملحد بریدہ سرت از قفا
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

کشتہ گشتی بہ تیغ جفا تشنہ لب
در سفر بے کس و بے گنہ بے سبب
قوم بیدین شدہ بے حیا بے ادب
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

شمر بنشتہ برسینہ ان آں زماں
ہم نمودند بالا سرت برستاں
اسپ کردند بر لاشئہ تودوان
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

آتش افتاد درخیمہ ہائے حرم
مال واسباب غارت نمود ندہم
قید کردند شاں را بظلم وستم
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

بعد ازاں کارواں شد رواں سوئے شام
بارسن بستہ و سر برہنہ تمام
دیدہ گریاں بسر خاک در خاص و عام
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

شد قلیچ ازغمت جاں فدا یاحسین
کردہ جن و ملک گریہ با یاحسین
از سما تا سمک شد ندا یاحسین
یاحسین یاحسین یاحسین یاحسین

نوحہ فارسی

اے وائے حسرتا ہاے کشتہ شد حسین
اے وائے مصیبتا ہائے کشتہ شد حسین
اے وائے در سفر لب تشنہ خوں جگر
بے جرم و بے خطا ہائے کشتہ شد حسین
اے وائے بے وطن بے گور وبے کفن
مظلوم مبتلا ہائے کشتہ شد حسین
با آل و باعیال غمگین و خستہ حال
بے برگ و بے نوا ہائے کشتہ شد حسین
کردہ بہ کوفہ رو بر دعوت آمد اُو
از قوم پُر دغا ہائے کشتہ شد حسین
یارانِ سر بکف کردند جاں تلف
با خویش و اقربا ہائے کشتہ شد حسین
عباس نامدار قاسم شدہ نثار
اکبر از آنسواء ہائے کشتہ شد حسین
در حلقہ شد اسیر ہم خورد تیغ و تیر
شد سر ز تن جدا ہائے کشتہ شد حسین
چوں جاں ز تن شکست برسینہ اش نشست
آن شمرِ بے حیا ہائے کشتہ شد حسین
غارت شدہ خیام شد ظلمہا تمام
صد جو رو صد جفا ہائے کشتہ شد حسین
اہل حرم ہمہ در رنج و غم ہمہ
بے پردہ بے ردا ہائے کشتہ شد حسین
عابد شدہ اسیر پابند و دستگیر
تا شام پیادہ پا ہائے کشتہ شد حسین
بسمل شدہ قلیچ بس خورد تاب و پیچ
شد برسرش فدا ہائے کشتہ شد حسین

نوحہ فارسی

یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین
اے شہِ کربلا مرحبا یاحُسین
اے شہیدِ بلا مرحبا یا حسین
اے قتیلِ جفا مرحبا یا حسین
یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین
نونہالِ گلِ گلشنِ فاطمہ
ناز پروردہ دامنِ فاطمہ
لعل رخشندہِ معدن فاطمہ
یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین
مصطفیٰ راشدی اے تو نورالبصر
مرتضیٰ راشدی اے تو جان و جگر
فاطمہ راشدی زینت فرق سر
یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین
اے ترا مصطفیٰ نصعہ منی بگفت
اے ترا مرتضیٰ دیدہ چوں گل شگفت
اے تیرا فاطمہ ، ہچو گوہر نہفت
یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین
برتو فضل و کرم ربّ الجلیل
انّما حجتت ھذاتی شد دلیل
داد مہدِ ترا جنبشے جبرئیل
یاحسین　یاحسین　یاحسین　یاحسین

فارسی نوحہ

دہر جفا کار کُجا ، اہلِ وفا دار کجا
قوم ستمگار کُجا زمرہ دیندار کُجا

راحت دل و دوزشدہ محنت منظور شدہ
مرحمت یار کُجا زحمت اغیار کُجا

آں سگ ملعون چو بُرید ایں سرِسرِ دارشہید
خوک خریدار کُجا گوہر شہوار کُجا

سینہ اطہر شہ دہن زانوائے آن شمر لعینی
نیزہ اشرار کُجا مظہر اسرار کُجا

زینب و کلثوم شدہ برہنہ سر ظلم زدہ
عترتِ اطہار کُجا کوچہ و بازار کجا

قافلہ جملہ زناں شد سبوئے شام رواں
عابد بیمار کجا طوق گراں بار کجا

ماتمِ گشتہ ، است بپا گریہ قلیچ است بجا
طاقت اظہار کجا دیدہ خونبار کجا

نوحہ اردو

ہائے ہائے کیا ماتم شور مچایا ہے
سب ارض سما کو ہلایا ہے گونج اٹھایا ہے

شہ دشت بلا میں آیا ہے آل بھی لایا ہے
کوئی کوفی ان کو بلایا ہے خط لکھوایا ہے

پھر جھوٹا غدر بتایا ہے سخت ستایا ہے
نہ کھانا ان کو کھلایا ہے نہ پلانی پلایا ہے

شہ اس کو بہت سمجھایا ہے کرم فرمایا ہے
کوئی رحم نہ اس نے بتایا ہے دین گمایا ہے

قاسم نے سر کٹوایا ہے دلہن رلایا ہے
عباس نے علم اٹھایا ہے ہاتھ کٹوایا ہے

اکبر نے گھوڑا لایا ہے فوج بھگایا ہے
اصغر نے پانی نہ پیا ہے تیر بھی کھایا ہے

رن میں شبیر اب آیا ہے قدم جمایا ہے
شمشیر سے صفیں اڑایا ہے پھر سر جھکایا ہے

تب شمر نے خنجر لگایا ہے پیاس بجھایا ہے
نیزے پر سر جھلایا ہے تھر تھرایا ہے

اور عمر نہیں شرمایا ہے ستم دکھایا ہے
عابد کو قید کرایا ہے ستم طوق پہنایا ہے

ساروان بھی ان کو بنایا ہے پیادہ چلایا ہے
اور شمر نے خیمے جلایا ہے مال لٹایا ہے

پھر حرم اونٹوں پہ چڑھایا ہے
کچھ نہ اوڑھایا ہے

پھر شرم سے منہ چھپایا ہے سر کھلوایا ہے
بچوں کے کان دُکھایا ہے خون میں نہلایا ہے

جب حکم یزیدی پایا ہے
قافلہ لایا ہے

اس سر کو تن سے ملایا ہے
چہلم آیا ہے

غم و درد دلوں میں بڑھایا ہے
جگ میں سمایا ہے

اب جس نے آنسو بہایا ہے
جنت پایا ہے

قلیچ نے سوز بنایا ہے
سب کو رُلایا ہے

غزل

جور خوباں ہے مجھے ہر دم و ہر باب پسند
خواہ ہوئے تیرنگہ خواہ ہوئے زلف کمند

اے صنم تیری تمنا میں رہا عمر تلک
آتشِ ہجر میں جلتا ہے جگر مثلِ سپند

تیرے آگے بہ خدا ہے نہ مسیحا کی مجال
لاکھ مُردوں کو جلاتا ہے تیرا شکرِ خند

گر جگہ پاؤں تیرے زلف چلیپا کے اوپر
پل میں ہو جاؤں میں منصور سے صد بار بلند

میں نہ چھوڑوں گا تیرے عشق کا پیچھا ہرگز
عمر بھر لوگ اگر ڈالیں میرے گوش میں پند

سیل خوں گرچہ ہے ہر عضو سے میرے جاری
باز آتا نہیں ظالم ز سر ظلم و گزند

کیا عجب شعر لکھا شاعرِ شیریں گفتار
جس کے ہر لفظ سے آتا ہے سوادِ گل قند

وائے جلاد تیری دشنۂ مژگان از بس
کرتی ہے میری جدا مثل قلم بند سے بند

کیا لکھوں ذکر تیرا سنگدل و کافر کیش
زار کرتا ہے زبوں سب کو تیرا فکر اور فند

بے مروت ہے قلیچ ایسی بری باتوں سے
یار کے حق میں بھلا اتنی شکایت تا چند

غزل

یا رب میرا وہ یار یگانہ کب آویگا
پھر عیش اور خوشی کا زمانہ کب آویگا

اُٹھا ہے جوش سینے میں آئی ہے جان بلب
مرتا ہوں میں مسیح سیانا کب آویگا

مدت سے ہے قفس میں میرا مرغ دل اسیر
ہے تلملاتا آب اور دانا کب آویگا

بولا تھا تجھ سے کر کے بہانا ملونگا میں
جلتا ہوں ہجر میں وہ بہانا کب آویگا

تنہائی میں رہا نہ کوئی شغل اے قلیچ
گانا کب آویگا اور بجانا کب آویگا

غزل

کیا بہت دن ہو گئے مجھ کو سجن ملتا نہیں
درد سے دل تنگ ہے فرج بدن ملتا نہیں

تلخی ہجرت نے مجھ کو کر دیا عاجز تمام
زہر کامی میں لب شکر شکن ملتا نہیں

بسترِ آرام پر سویا پڑا ہے ناز سے
اس شہیدِ تیغِ ہجرت کو کفن ملتا نہیں

یاد گیری میں سجن کے سر پٹکتا ہوں سدا
یا الٰہی دافعِ رنج و محن ملتا نہیں

چشم گریاں سینہ بریاں ہیں فراقِ یار میں
دُر بہت سے ہیں ولے دُرِ عدن ملتا نہیں

کلبۂ احزان میرا تیرگی سے ہے تباہ
کیا ہوا یا رب شمعِ انجمن ملتا نہیں

دم میں ملاّ جی کروں وحدت کی کھاتا ہوں قسم
حیف صد حیف اس کے زلفوں کا رسن ملتا نہیں

موت شیریں جانتا ہے عشق کی پرویز لیک
زیرِ چرخِ بے ستوں اب کوہ کن ملتا نہیں

زندگی سے تنگ ہوں بے یار باغِ دہر میں
بے کلی ہے دل کو وہ غنچہ دہن ملتا نہیں

غزل

دیدۂ مست اُٹھایا نہ کرو
فتنۂ خفتہ جگایا نہ کرو

گالیاں دیتے ہو کیوں اے ظالم
بیدلوں کو تو ستایا نہ کرو

خون ہوتا ہے جگر عاشق کا
لب کو لالی تو لگایا نہ کرو

سارے عالم میں ہوا اندھارا
شمعِ عارض کو چھپایا نہ کرو

خنجر و تیر چلا جاتا ہے
آنکھ سے آنکھ لڑایا نہ کرو

غیرت آتی ہے مجھے بے غایت
مردمِ عام میں جایا نہ کرو

چھوڑ دو ناز ادا اے کافر
راہِ اسلام بھلایا نہ کرو

منتظر ہوں میں تیرے آنے کا
وعدۂ وصل پھرایا نہ کرو

خال پر زلف بنا رکھتے ہو
طائرِ دل کو پھنسایا نہ کرو

جھوٹ کہتا ہے تجھے جھوٹ رقیب
ہر سخن گوش میں لایا نہ کرو

آتشِ ہجر میں جلتا ہے قلیچ
پر دو بار اس کو اب اسے اور جلایا نہ کرو

غزل

میں تیرے ہجر میں مرتا ذرا دیکھو تو سہی
اٹھایا جان پہ رنج و بلا دیکھو تو سہی

میں تیرے وصل کی امید قطع کی مطلق
یقین بوسہ نہ دو گے بھلا دیکھو تو سہی

لگایا تیغ نگہ تو نے کیسا رے قاتل
ہزار زخم جگر پر کیا دیکھو تو سہی

عجب یہ ظلم کہ ہنس ہنس کے خوں عاشق کو
لگاتا ہاتھوں کو مثل حنا دیکھو تو سہی

دو چشمِ مست تو انداخت فتنہ در عالم
بلحظۂ شدہ محشر بپا دیکھو تو سہی

ذرا تو صلح و صفا کر کے تیرے غصے نے
جلایا آگ میں ارض و سما دیکھو تو سہی

سناؤ میں نے تیری کی ہے کیا خطا اے شوخ
عبث تو ہوتا ہے مجھ سے خفا دیکھو تو سہی

قلیچ جور و جفا سے نہ ڈر رقیبوں کے
خراب ان کو کرے گا خدا دیکھو تو سہی

غزل

قتل کو عاشقوں کے ایک مژہ کا تیر کافی ہے
دلِ دیوانے کو ایک زلف کی زنجیر کافی ہے

چلے ہو صید کرنے کو، کٹاری ہاتھ میں لے کر
لگا دو یہ جگر میرا تجھے نخچیر کافی ہے

قسم ہے گر مجھے ہووے ہوس کچھ اور چیزوں کا
تیرے کوچے کی خاک اے جان مجھے اکسیر کافی ہے

کہ جس کو شوق کامل ہے بقائے نور اللہ کا
زیارت کے لیے اس کو تیری تصویر کافی ہے

خدا کے واسطے ناصح زباں کو تھام لے اپنے
نہیں مجھ کو غرض کسی کی مجھے یہ پیر کافی ہے

خیالِ خام ہے سر میں مجھے معراج پانے کا
شہیدِ عشق جانا کو سرِ شمشیر کافی ہے

خدا جانے صبح تا شام واعظ کیا یہ کہتا ہے
دلِ بینا کو تیرے چشم کا تفسیر کافی ہے

کہو مطرب کو اٹھے اپنے سازوں کو جلا دیوے
تیرے شیریں دہن سے اے سجن تقریر کافی ہے

قلیچ اعدا کی کچھ پروا نہیں گر سینکڑوں آویں
مدد کرنے کو میرے شبر و شبیر کافی ہے

غزل

محبت جس سے ہے میری وہ کب یہاں دلربا آوے
مریضِ عشق مرتا درد دل کی کب دوا آوے

بدن لاغر جگر خوں ہو گیا ہے دردِ ہجرت میں
نکل جاتا ہے دم کس طرح وہ مشکل کشا آوے

جدائی کی گھڑی مجھ پر بہت مشکل گزرتی ہے
الٰہی خیر سے کب وہ میری خیرالنساء آوے

گیا ہے طاقت و آرام فکر و انتظاری میں
ملے جب دوست دلبر تب مجھے صحت و شفا آوے

بتا دو حال میرا اس بتِ ظالم کو اے قاصد
مگر دل میں اسی کے رحم کا قطرہ ذرا آوے

کہو کیا کیا ستم تنہائی میں سر پہ اٹھاتا ہوں
مگر وہ بے وفائی چھوڑ کر اب با وفا آوے

ملا تھا دوست یا رب بعد برسوں کی مشقت کے
جدا وہی ہوا پھر کب میرا بخت رسا آوے

نہ کرنا خوف ماضی کے گناہوں کا قلیچ اتنا
قیامت میں شفاعت کو محمدؐ مصطفیٰؐ آوے

غزل

جور خوباں ہے مجھے ہر دم و مہرباں پسند
خواہ ہو تیر نگہ، خواہ ہوئے زلفِ کمند

اے صنم تیری تمنا میں رہا عمر تلک
آتش ہجر میں جلتا ہے جگر مثلِ سپند

تیرے آگے بخدا ہے نہ مسیحا کی مجال
لاکھ مردوں کو جلاتا ہے ترا شکر خند

گر جگہ پاؤں تیری زلف چلیپا کے اوپر
پل میں ہو جاؤں میں منصور سے صد بار بلند

میں نہ چھوڑوں گا تیرے عشق کا پیچھا ہرگز
عمر بھر لوگ اگر ڈالیں مرے گوش میں پند

سیل خوں گرچہ ہے ہر عضو سے میرے جاری
باز آتا نہیں ظالم زقہر ظلم و گزند

کیا عجب شعر لکھا شاعرِ شیریں گفتار
جس کے ہر لفظ سے آتا ہے سواد گلقند

وائے جلاد تیری دشنہ مژگاں از بس
کرتی ہے میرے جدا مثلِ قلم بند سے بند

کیا لکھا ذکر تیرا سنگدل و کافر کیش
زار کرتا ہے زبوں سب کو تیرا مکرو فند

بے مروت ہے قلیچ ایسی بری باتوں سے
یار کے حق میں بھلا اتنی شکایت تاچند

غزل

تیرے عشق کو میں سدا چاہتا ہوں
محبت تیری جا بجا چاہتا ہوں

نہ شاہی وزیری سے مطلب ہے میرا
تیرے در پہ ہونا گدا چاہتا ہوں

نسیم بہشتی نہ بھاتی ہے دل کو
میں تیری گلی کی ہوا چاہتا ہوں

تیرے ہجر میں عمر گزری ہے ساری
ذرا ساتھ تیرے ملا چاہتا ہوں

تیرے تیر مژگاں کیا زخم دل میں
تیرے لعلِ لب سے دوا چاہتا ہوں

مجھے آتی ہے لذت نہ جینے میں جانی
تیرے درد و غم میں موا چاہتا ہوں

خدا سے تیری خیر کا ہوں میں سائل
فقط سر پہ اپنے بلا چاہتا ہوں

قلیچ اس جہاں میں غرض ہے نہ کس سے
خدا چاہتا ہوں خدا چاہتا ہوں

غزل

ہیں ہم صوفی سب کو بلاتے رہیں گے
اور اک دوسرے سے ملاتے رہیں گے

اخوت دکھائیں گے اور آدمیت
صفت صلح کل کی بھی گاتے رہیں گے

رہیں گے جس قوم و ملت میں، اس میں
صداقت کا ڈنکا بجاتے رہیں گے

کبھی بت کدے میں کبھی مے کدے میں
سبھوں کو کھلاتے پلاتے رہیں گے

سنا کر سبھوں کو فسانے عجائب
یہ نو بت ہنساتے، رلاتے رہیں گے

قلیچ ایسے ہمدم ملیں گے گر تو ان کو
تصوف کے نکتے سناتے رہیں گے

غزل

لالہ رخا، سمن برا، سروئے قدا، تو کون ہے!
سنگ دلا، ستم گرا، ماہ و شا، تو کون ہے

دیکھتے ہی تجھے میرے عقل و حواس اڑ گئے
صبر و قرار دین و دل جملہ گیا تو کون ہے

تیغِ نگاہ سے اے سجن تو نے کیا جہاں کو قتل
حور و پری ہے یا ملک سچ تو بتا تو کون ہے

میں نے کی عرض جب اسے بوسہ دو تلخ کام ہوں
ناز و ادا سے ہنس کے وہ کہنے لگا تو کون ہے

ظلم و ستم تیرا صنم لیتا ہزار دل سے میں
ایک لذیذ ہے تیرا جور و جفا تو کون ہے

تیری تجلی سے ہوا روح قلیچ کالعدم
ہستی سے ہوں میں بے خبر بہر خدا تو کون ہے

غزل

فریاد فلک پر ہے تیری تیغ نظر سے
رنجور ہے نرگس تیری چشموں کے اثر سے

یاقوت خجل تیرے لب لعل کے آگے
دل خون ہے لالہ کا ہمہ داغ جگر سے

واری ہوں میں سو جان سے ہر ایک قدم پر
آنکھوں میں میرے یار کی دو جیسے گہر سے

جب دیکھتا ہوں عارضِ روشن تیرا جانی
یاد آتا ہے ایک پل میں مجھے شمس و قمر سے

اے شوخ میرے قتل کا شائق ہو تو آؤ
راحت مجھے آئے گی تیرے تیغ و تبر سے

دل سے نہ مٹا دوں گا کبھی تیری محبت
شمیر دو سر جائے نکل گر میرے سر سے

یک رنگ تیرے عشق میں ہر دم ہوں اگرچہ
رگ رگ میری جلتی ہے تیرے ظلم و قہر سے

پیوند نہ ٹوٹے گا تیرے مرگ سے میرے
آواز تیرے نام کا آئے گا قبر سے

راضی ہے صنم میرا قلیچ ایسی غزل پر
کمتر نہیں قیمت میں کبھی دُر و گہر سے

غزل

جاتی نہیں دہن سے میرے بو شراب کی
وہ وہ شراب رشک ہے کوثر کے آب کی

دیشب مئے وصال کا ایک جام جو پیا
بیداری کی خبر نہ رہی اور نہ خواب کی

بوسہ دیا جو اُس لب شیریں کو شوق سے
بس تلخ آئی لذت قندو گلاب کی

بل کھا کے زلف لے لیا ایک دل بصد کمند
کہہ کیا سکوں حکایتیں اس پیچ و تاب کی

عارض میں اس کی ساری خدائی نظر پڑی
ہر خال و خط تھا آیت ام الکتاب کی

کھولی زباں وہ طوطی شیریں مقال جب
تن تن تمام دب گئی چنگ و رباب کی

نازو ادا سے آیا تبسم میں جب صنم
مشکل شتاب کھل گئی شیخ و شباب کی

دل ایسا محو ہو گیا صحبت میں یار کے
طاقت رہی نہ مجھ کو سوال و جواب کی

عالم تھا بے خودی کا عجب کیا کروں بیاں
مطلق یہاں سے اٹھ گئی حاجت حجاب کی

اوپر گیا میں دم میں سلیماں سے در گزر
پروا رہی نہ رستم و افراسیاب کی

جل جل گیا رقیب حسد سے اے دوستو
دیکھو تو شکل اس خرِ خانہ خراب کی

مت خوف کر عذابِ قیامت سے اے قلیچ
لی ہے پناہ میں نے شہِ بوتراب کی

غزل

عاشقوں سے اے صنم اتنی جدائی تابہ کے!
آشناؤں کے لیے ناآشنائی تابہ کے!

جب تیرے نازو ادا پر خود بخود کشتہ ہوں میں
خنجر و شمشیر سے ناحق لڑائی تابہ کے

عمر بھر در پر تیرے میں رہ گیا اے شاہ حسن
ایک بوسے کے لیے میری گدائی تابہ کے

شہر میں عابد فریبوں کی عبادت پر غرور
اے دلِ نا پارسا یہ پارسائی تابہ کے

ہاتھ تیرا اے بتِ کافر تماشے کے لیے
بے دلوں کے خون سے ہو گا حنائی تابہ کے

حسن گل کی پائیداری اک نفس باقی نہیں
آخر اے بلبل تیری نغمہ سرائی تابہ کے

سر کشی سے محفلِ پروانہ میں کرنا قتال
سوچ لے اے شمع اتنی خود نمائی تابہ کے

نوعروسِ ملک کی آغوش میں ہو بے خیال
اے شہنشاہ دیکھیے یہ کت خدائی تابہ کے

میں نہیں دم مارتا ہوں شاعری کا اے قلیچ
شاعروں کے ساتھ پھر طبع آزمائی تابہ کے

Hasnain Sialvi

مزاحیہ غزل

دیکھو دیکھو نازو ادا سے پیاری میڈم آتی ہے
دور سے اپنا ہینڈ اٹھا کر مجھ کو ادھر بلاتی ہے

ہاؤس میں اپنے لے کر مجھ کو ہر دم لو بتاتی ہے
شائننگ گلاس اٹھا کر مجھ کو عمدہ وائن پلاتی ہے

جینٹل جینٹل ڈانس دکھا کر ویری گڈ گانا گاتی ہے
عجب عجب کاٹون بنا کر انگلش سانگ سناتی ہے

جب میں سیڈ اور سائیلنٹ بیٹھوں ماؤتھ سے ماؤتھ ملاتی ہے
لافنگ لافنگ بہت مزے سے پیانو فورٹ بجاتی ہے

تھاؤزنڈ کسز دے کر مجھ کو سائڈ میں اپنے بٹھاتی ہے
لپٹ جھپٹ کر دام میں اپنے میرا ہارٹ پھنساتی ہے

نظر کروں جب فیس میں اس کے سر پر ہیئر بناتی ہے
میٹھی میٹھی ناک سے مجھ کو ایک دم آف اڑاتی ہے

جب میں وصل کی عرض کروں تب گاڈ کی قسمیں کھاتی ہے
ایوری ڈے شی کمز ٹو می اور پرامز دے کر جاتی ہے

میری جان قلیچ نہایت درد اور رنج اٹھاتی ہے
لانگ ٹائم سے لو کی فائر میری جان جلاتی ہے

علمی و ادبی کارنامے

شمس العلماء، مرزا قلیچ بیگ کے عملی وادبی کارناموں کا دائرہ خاصہ وسیع ہے۔ مختلف زبانوں میں آپ کی تحریر کردہ 457 کتابوں سے اکثر کتب کو شہرت دوام حاصل ہے۔ نثر و نظم کی درجنوں کتابیں ایسی ہیں جن کو بار بار زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا جاتا رہا ہے۔ اب تک یہ باور کرایا جا چکا ہے کہ قلیچ بیگ سندھی زبان کے اولین ناول نگار، اولین ڈرامہ نویس اور دیگر کئی اصناف کے موجد تھے، لہٰذا آپ کو سندھی ادب کے عناصر خمسہ میں سب سے برتر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ قلیچ بیگ اپنی مذکورہ بالا تمام حیثیتوں کے ساتھ سندھی زبان کے منفرد اور صاحب طرز نثر نگار ہیں جن کا ثانی سندھی ادب میں آج تک پیدا نہ ہو سکا ہے۔

اس باب میں مرزا صاحب کی لکھی چند مشہور کتابوں کے تعارف پیش کیے جا رہے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں ان کی تحریر کردہ تمام کتب کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے مرزا قلیچ بیگ ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخص تھے۔ جدید سندھی ادب کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں مرزا قلیچ بیگ کے ان مٹ نقوش موجود نہ ہوں۔ وہ معجز بیان شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ تحقیق و تدوین میں بھی وہ درجہ کمال پر فائز تھے۔ انگریزی، فارسی، عربی اور اردو سے بے مثال تراجم کے ذریعے انھوں نے جدید سندھی ادب کے خزانے کو نہایت پُر مایہ بنا دیا ہے۔ لیکن ان سب کمالات میں فکشن کے باب میں ان کی خدمات یکسر بے مثال ہیں۔ ذیل میں سب سے پہلے ہم ان کے طبع زاد ناول زینت کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

نقادان سندھی ادب کی نظر میں قلیچ بیگ سندھی نثر کے ''معمارِ اعظم'' اور اس کے تاسیسی دور کے بلند پاد گزار ادیب تھے۔

اپنی گوناں گوں اور خداداد صلاحیتوں کے طفیل وہ سندھی زبان میں کئی جدید اصناف کے موجد بنے۔ ناول ''زینت'' ان کا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ جسے سندھی ادب میں کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ یہ قلیچ بیگ کا طبع زاد ناول ہے جسے آپ نے 1890ء میں مکمل کیا۔ اپنی بُنت کاری میں ایک نصیحت آموز اور خالص سندھ کے گھریلو ماحول کا نمائندہ ناول ہے۔ اور شروع تا آخر اخلاقی اسباق سے عبارت ہے۔

''زینت''اس ناول کے بنیادی کردار کا نام ہے، جو پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور روشن خیال خاتون ہے اور ناول کے ابتدائی ستر، اُسی صفحات زینت کی ذاتی خوبیوں، گھریلو حالات اور اس کی شادی کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ناول کے ابتدائی باب میں، تمام ایسی خرابیوں اور برائیوں کے خاتمے اور انہیں ترک کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔ جو ہر معاشرے میں فساد کی جڑ ہوتے ہیں۔ مثلاً بچیوں کی بہت کم عمری میں شادی، یا بغیر رضامندی لیے لڑکی کو شادی کے بندھن میں جکڑ دینا۔ خواتین کو پردے کا سخت پابند بنا دینا کہ وہ کھل کر سانس بھی نہ لے سکیں، شادیوں میں فضول خرچی، بچیوں کو تعلیم سے محروم رکھنا وغیرہ۔ ناول کے دوسرے باب میں زینت کے اپنے شوہر سے اچانک بچھڑ جانے کا حادثہ اور پھر اس کا مشکل حالات سے دوچار ہو جانا، اس صورتِ حال میں قلیچ بیگ نے پیغام دیا ہے کہ ایسے حالات میں عورت کا تعلیم یافتہ ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے!

زینت کو اس ناول میں چونکہ تعلیم یافتہ خاتون کے طور پر ابھارا گیا ہے۔ لہٰذا مشکل حالات سے وہ بڑی خوش اسلوبی سے پار لگ جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ تعلیم یافتہ اور عقل مند خاتون ہے لہٰذا انہی خوبیوں کو کام میں لاتے ہوئے ناول کے آخری حصے میں وہ بچیوں کے لیے جدید طرز کے اسکول قائم کرتی ہے اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرتی ہے اور یوں یہ خاندان عزت و خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ زینت ناول نہایت عام فہم اور دلنشین اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے شروع سے آخر تک اس میں دلچسپی کی کارفرمائی قائم رہی ہے اور اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

مقالات الحکمت

سال 1853ء میں موجودہ جدید سندھی (املا) رسم الخط تیار ہوا، حروفِ تہجی کے تیار ہوتے ہی سندھی زبان میں کتابیں لکھنے کا رواج عام ہوا۔ اخبار بینی شروع ہوئی۔ اخبار نویسی ہی کی بدولت نثر میں مختلف اصناف لکھنے کا آغاز ہوا۔ خاص طور پر سندھی زبان میں مضمون نویسی تو صحافت ہی کی بدولت عام ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ اس صنفِ نثر میں کئی لکھنے والوں کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ قلیچ بیگ کو ابتداء ہی سے نثر و نظم لکھنے سے دلچسپی تھی اور یوں نثر لکھنے کا آغاز آپ نے مضمون نویسی سے کیا۔

اس زمانے میں لارڈ بیکن کی کتاب Becons Essays انگریزی زبان کی ایک مشکل اور دقیق کتاب شمار کی جاتی تھی۔ قلیچ بیگ نے سال 1877ء میں سب سے پہلے اسی کتاب کا ترجمہ مکمل کیا اور اس کا نام مقالات الحکمت رکھا۔ خوش قسمتی سے مضامین کا یہ مجموعہ اسی سال اشاعت سے آراستہ ہوا۔ کتاب شائع ہوتے ہی زبان و بیاں کی سلاست و نکتہ آفرینی کے باعث ہر خاص و عام میں مقبول ہوگئی۔ خاص طور پر نہایت دلچسپ انداز میں، موت، سچ، دوستی، مطالعہ، شک و گمان، فضول خرچی، تندرستی، بحث و مباحثہ، دولت، حسد، جرأت، سیر و سفر، بادشاہی، لالچ وغیرہ جیسے رنگا رنگ موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین کو پڑھنے والوں میں بڑی پذیرائی ملی اور یوں یہ کتاب آج تک سندھی ادب کے نثری سرمائے میں بڑی اہمیت کی حامل کتاب قرار دی جاتی ہے۔

قلیچ اور لطیف شناسی

مرزا صاحب کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے انتہائی عقیدت تھی۔ وہ مقامِ لطیفؒ سے آگاہ تھے۔ اور بخوبی جانتے تھے کہ شاعری اور تصوف میں شاہ صاحب کا رتبہ کیا ہے۔ لہٰذا قلیچ نے بڑی محنت وتلاش سے تحقیق کر کے حضرت شاہ سائیں کا رسالہ مرتب کیا۔ جو 1913ء میں شکار پور سندھ کے مشہور پبلشر ہو کرداس نے شائع کیا۔ اس سے پہلے اگرچہ لطیف سائیں کے ابیات کا رسالہ بمبئی سے شائع ہو چکا تھا۔ اور 1866ء میں جرمن اسکالر ڈاکٹر ٹرمپ صاحب بھی جرمنی کے شہر لیپزنگ سے شاہ صاحب کے کلام کا ایک نامکمل رسالہ شائع کروا چکے تھے۔ مرزا صاحب نے اس کام کو ادھورا پاتے ہوئے اپنی تحقیق کے مطابق شاہ کا رسالہ مرتب کیا۔ اور اپنے مرتب کردہ رسالے میں مکمل کلام شامل کیا۔ قلیچ صاحب کا تالیف شدہ رسالہ کلامِ لطیف 4123 ابیات اور 240 وائیوں پر مشتمل ہے۔ اور اسے دوسرے ایڈیشن کے طور پر 1994ء میں سندھی لینگویج اتھارٹی حیدر آباد کی جانب سے شائع کیا جا چکا ہے۔

اس تالیف کے بعد آپ نے بڑی محنت اور مہارت سے شاہ سائیں کے مکمل رسالے کے مشکل سندھی الفاظ کی جامعہ لغت تیار کی جسے لغاتِ لطیف کا نام دیا۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اس لغت کے بعد اب تک سندھی زبان میں ایسی کوشش پھر کسی محقق نے نہیں کی۔ مزید براں یہ کہ اسی سلسلے میں آپ نے 1882ء کے عشرے میں پہلے انگریزی میں۔Life of Shah Abdul Latif Bhitai تحریر کی اور بعد ازاں اس انگریزی کتاب کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے اس کا نام احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی تجویز کیا۔

حیاتِ لطیف کے متعلق ان کی مذکورہ بالا کتاب 1905ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے حیات لطیف کے کئی اہم گوشے منور ہوئے ہیں۔ اور کلامِ لطیف کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی پڑی ہے۔ کلامِ لطیف پر تحقیق اور ابیات کی لغت تیار کرنے کے علاوہ بھی مرزا صاحب نے شاہ صاحب کے سُر سوھنی (1913ء) سُر

سی (1914ء) کی شرح بھی تحریر کی اور نیز اس سلسلے میں آپ کی کتاب، لطیفی لات جس کا نیا ایڈیشن 1994ء میں شائع ہوا ہے۔ لطیفیات کے سلسلے میں نہایت ہی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ حال ہی میں 2006ء میں اسی تسلسل میں خزانہ قلیچ سے برآمد لطیف شناسی کے متعلق آپ کی ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے۔ شاہ جے رسالے جی کنجی۔ یہ کتاب گویا رسالہِ لطیف کی انڈیکس ہے۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے لفظیات لطیف جمع کیے ہیں۔ اور ہر لفظ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ لطیف سائیں نے یہ لفظ کہاں کہاں اور کس کس طرح استعمال کیا ہے۔ قلیچ اور لطیف شناسی کے سلسلے میں یہ ایک مختصر ترین تعارف ہے۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ لطیفیات کے سلسلے میں قلیچ صاحب کی تحریر کردہ ایسی تمام کتابوں پر جدا جدا مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔

قلیچ اور تاریخ سندھ

سندھی ادب کے ذخیرے میں کتابیاتِ قلیچ کی تعداد 457 ہے۔ ان میں ہر موضوع پہ کتابیں شامل ہیں۔ طبع زاد نثری اور منظوم تخلیقات بھی ہیں اور ترجمے، تحقیق، تاریخ، لغت نویسی، باغ بانی، لطیف شناسی وغیرہ پر بھی کئی نایاب کتب شامل ہیں۔ آپ نے سوانحی موضوعات پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ سائنسی ایجادات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، لسانی مسائل اور زبان ولسان کے قواعد بھی ان کے دائرہ تحریر میں شامل ہیں۔

مغربی ادب سے انسپائر (Inspire) ہوتے ہوئے ان جدید اصناف کو بھی سندھی زبان میں آپ ہی نے متعارف کروایا۔ گویا سندھی شعر کی تاریخ ہو یا تاریخ سندھ، احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی ہو یا سندھ کے آثارِ قدیمہ کا احوال، وادی سندھ کے قدیم شہروں اور مشاہیر کا تذکرہ، ناول، افسانہ، مضمون نویسی ہو کہ ڈرامہ، یہ سب اصناف مرزا صاحب کے طفیل اور توسط سے ہی سندھی زبان میں متعارف ہوئیں۔ اس باب میں ہم مختصراً مرزا صاحب کی لکھی ہوئی تاریخی کتب کا جائزہ لیں گے۔

تاریخِ سندھ کے متعلق اور پس منظر میں مرزا صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں تیار کی ہیں۔

1۔ چچ نامہ۔۔ انگریزی میں (1900ء)

2۔ سندھ کی تاریخ۔۔ انگریزی میں (1901ء)

3۔ سنڌ جي تاريخ تصويرن سان (1906ء)

4۔ سنڌ جي مختصر تاريخ (1915ء)

5۔ سنڌ جا قدير ماڻهو ۽ انهنن جا مشهور ماڻهو (1921ء)
(سندھ کے قدیم شہر اور مشہور لوگ)

6۔ رياست خير پور جي تاريخ (1922ء)
(ریاست خیر پور کی تاریخ)

7۔ چچ نامو سندھی میں (1923ء)

8۔ ٽالپرن جي صاحبي انگريزن جي دور ۾ (1928ء)
(تالپور بادشاہوں کا دور)

چچ نامہ

جو اصل میں پہلے عربی میں لکھا گیا تھا اور پھر فارسی میں منتقل کیا گیا۔ سندھ کے رائے اور برھمن خاندان کے دورِ حکومت کا تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں سندھ میں عرب فتوحات کا بیان بھی موجود ہے۔ مرزا صاحب سے پہلے جستہ جستہ چچ نامہ کے مختلف ابواب کے ترجمے انگریزی زبان میں کیے گئے تھے۔ مگر اسے مربوط اور باضابطہ انگریزی زبان میں سب سے پہلے مرزا قلیچ بیگ نے منتقل کیا۔ آپ کا یہ ترجمہ کمشنر پریس کراچی 1900ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی میں اس کتاب کا مکمل نام یہ ہے۔ The Chach namah an ancient hitory of Sindh۔ مرزا صاحب کے عزیز ترین دوست اور ماہر قانون دان سیشن جج مسٹر ڈیارام گدومل نے اس کتاب کے لیے نہایت ہی عمدہ تعارف تحریر کیا۔

سنڌ جي تاريخ (تاریخ سندھ)

مرزا صاحب نے اس کتاب میں چچ نامہ سے آگے کی تاریخ رقم کی ہے۔ اور خصوصاً سندھ میں دورِ اسلامی پر مطالعہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں 15 ابواب ہیں۔ اور ان میں عرب دور تا مغل نواب پیریڈ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں کلہوڑا اور تالپور پیریڈ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ سال 1902ء میں کمشنر پریس کراچی سے شائع ہوئی۔ سال 1982ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سندھ کلاسکس کراچی کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

سنڌ جي تاريخ تصويرن سان (تاریخ سندھ مع تصاویر)

مرزا صاحب کی یہ کتاب، سال 1903ء میں قیصریہ پریس حیدرآباد سے اشاعت پذیر ہوئی۔ کتاب میں کل 33 ابواب ہیں۔ اور اس میں سندھ کی جاگرافی اور سندھ کے قدیم باشندوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو تالپور اور انگریز حکمرانوں کی تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔ کراؤن سائز میں اس کے 191 صفحات ہیں۔

سنڌ جا قديم شهر ۽ مشهور ماڻهو
(سندھ کے قدیم شہر اور مشہور لوگ)

سندھی زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی تحریر ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے کے لیے مرزا صاحب نے میر علی شیر قانع کی کتاب ''تحفۃ الکرام'' اور ھیوز صاحب کے تیار کردہ سندھ گزیٹیئر سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں 15 ابواب پر مشتمل تھی۔ مگر بعد میں مرزا صاحب کی لکھی ایک اور اس طرح کی کتاب ''قدیم سندھ جا ستارا'' کو بھی اس کتاب کا حصہ بنا دیا گیا۔ اور اس طرح اب اس نئی صورت حال کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ جام شورو سے یہ اشاعت دوئم کے طور پر حال ہی میں شائع کی گئی ہے۔

ریاست خیرپور جي تاریخ **(تاریخ ریاست خیر پور)**

یہ کتاب مرزا صاحب نے والئی ریاست و معروف شاعر میر علی نواز ناز کی ذاتی درخواست اور فرمائش پر 1922ء میں رقم کی۔ کتاب میں کل 20 ابواب ہیں۔ جس میں تالپور بادشاہوں کے علاوہ ان کے کچھ وزراء اور انگریز عمل داروں کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار فیض پریس خیر پور سے سال 1924ء میں اشاعت پذیر ہوئی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

چچ نامو

یہ کتاب اصل میں سندھ کی تاریخ کے بنیادی ماخذ ''چچ نامہ'' کا سندھی ترجمہ ہے۔ اور یہ کتاب مرزا صاحب نے سال 1923ء میں مکمل کی تھی۔

سنڌ جي مختصر تاريخ **(سندھ کی مختصر تاریخ)**

آپ نے یہ تاریخی کتاب 1915ء میں مکمل کی۔

سائو پن یا کارو پنو

اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھی ادب میں اب تک لکھی تمام خود نوشت سوانحِ حیات میں قلیچ بیگ کی تحریر کردہ آٹو بایوگرافی ''سائو پن یا کارو پنو'' اپنی نوعیت کی منفرد ترین سوانح حیات ہے۔ آپ نے یہ شہرہ آفاق تصنیف بہ عمر 70 سال 1923ء میں تکمیل کی تھی، اور اس کے لکھے جانے کے سات سال بعد تک آپ اس جہانِ رنگ بو میں حیات رہے۔ یہ سوانح حیات پہلی بار 1965ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوئی اور اس کی مقبولیت کا اب تک یہ عالم ہے کہ تاحال تھوڑے وقفے سے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنی تمام زندگی کو اس کتابِ حیات کے 12 ابواب میں تقسیم و بیان کیا ہے۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ آباؤ اجداد، بچپن، ابتدائی تعلیم، جوانی اور مزید تعلیم، ملازمتیں، بڑھاپا و عرصہ گوشہ نشینی، معزز اشخاص سے ملاقاتیں، ادبی کام اور اس کی قدر شناسی، عادات واطوار، خواہشیں، خیالات، ذات و خانوادے کے متعلق معاصرینِ زمانے کی آراء، تحریر کردہ تمام کتب کی فہرست اور شجرا۔ یہ سوانح حیات ڈیمی سائز کے 266 صفحات پر مشتمل ہے۔ بچپن تا جوانی و بڑھاپے تک مرزا صاحب کی تصاویر کا البم بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ اس آپ بیتی کے دل پذیر اسلوب کے باعث آغاز ہی سے ہم مصنف کے نزدیک آجاتے ہیں۔ اور اسے مزید پڑھتے ہوئے فوراً احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک نہایت پڑھے لکھے، روشن خیال، دردمند اور فرض شناس آفیسر اور دل موہ لینے والی شخصیت کے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ یہ سوانحِ حیات بہت حد تک اپنے وقت کی سماجی و معاشرتی و ادبی صورت حال کا احاطہ کرتی ہے۔ لہٰذا اسے ہم اپنے زمانے کی زندہ جاوید تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کتاب کے اختتام پر روزنامچہ قلیچ سے انتخاب دیا گیا ہے اور اس انتخاب میں مرزا صاحب کی برصغیر کی جن معروف شخصیات سے ملاقات ہوئی تھی، ان کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ موجود ہے۔

مرتبہء قلیچ (خراجِ تحسین)

مرزا صاحب مذہبی نقطۂ نگاہ سے صوفیائے کرام کے نظریے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ نفرت کو کفر اور عشق کو عین اسلام تصور کرتے تھے۔ اپنی عادات و عمل میں اعتدال پسند اور صلح کل کے قائل تھے۔

مرزا صاحب سے ہمارے خاندان کے دیرینہ اور نہایت دوستانہ تعلقات تھے میرے والد صاحب کی شہادت کے بعد میری ابتدائی تعلیم و تربیت میں مرزا صاحب نے خصوصی دلچسپی لی۔ سال 1922ء کے بعد تو میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ آپ کی صحبت میں جا کر بیٹھتا تھا۔ آپ کی یادگار کے طور پر اپنے گاؤں سن میں، میں نے باب قلیچ قائم کیا تھا۔ اور مین شہر سے ریلوے اسٹیشن تک کا جو راستہ ہے وہ بھی میں نے آپ ہی کے نام سے منسوب کیا تھا۔

میری ذاتی فائلوں میں، مرزا صاحب کے محبت بھرے مکتوب آج بھی بہت احترام سے محفوظ ہیں۔

جی، ایم سید

کتاب: جنب گذاریم جن سین

☆☆☆☆☆

میرے دل میں صرف ایک سندھی اسکالر کے لیے احترام ہے۔ اور وہ ہیں قلیچ بیگ!

ان کے وسیع ذوق نے ان کو اپنے دور کے گوناں گوں ادب سے روشناس کرایا۔ قلیچ بیگ ہمارے ادبی ذوق اور انقلاب کے بانی تھے۔

جب جب میں اپنے تصور کے قالین کے تانے بانے ٹٹولتا ہوں تو اس میں موجود کچھ رنگین دھاگے مجھے قلیچ بیگ کے بھی نظر آتے ہیں۔ شاہ لطیفؒ کے بعد میں ان کو سندھ کی عظیم ترین ادبی شخصیت مانتا ہوں۔

شیخ ایاز (اقتباس: ڪاڪ ڪڪوريا ڪاپڙي) صفحہ 102-41)

☆☆☆☆☆

قلیچ بیگ نے ہی سندھی قوم کو جدید علم و فکر سے روشناس کرایا تھا۔ میں ان کو اپنے دور کا Genius تصور کرتا ہوں۔ وہ ایک سیکیولر عالم تھے اور ان کی انسان دوستی پر میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔

سوبھو گیان چندانی (دانشور)

☆☆☆☆☆

مجھے مرزا صاحب کی زیارت کا شرف حاصل تھا۔ اور میں نے آپ کو سکھر (سندھ) میں منعقدہ

شیعہ کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا۔ میں اس وقت روزنامہ سندھ زمیندار کا ایڈیٹر تھا۔ اس حیثیت سے کانفرنس کو رپورٹ کرنے کے لیے وہاں موجود تھا۔

اسٹیج پر ڈائس کے قریب پہنچ کر میں نے آگے بڑھ کر ان کی دست بوسی کی۔ بڑی شفقت سے آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں، آپ ایک شاندار کوٹ میں ملبوس تھے، خاصے دبلے پتلے تھے۔ چہرے کا رنگ سرخی مائل اور گورا تھا۔ بڑی ہی شاندار شخصیت کے مالک تھے۔

سب سے پہلے سندھی زبان میں لکھی گئی جس کتاب کو پڑھ کر مجھے سندھی علم وادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور متاثرہ ہوا وہ بھی آپ ہی کی تحریر کردہ کتاب تھی۔ کتاب کا نام تھا ''احوال شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ''

پیرعلی محمد راشدی

کتاب:اُهي ڏينهن اُهي شينهن

☆☆☆☆☆

کتب خانہ قلیچ ٹنڈو ٹھوڑو ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں سے امر جوت مشعل روشن ہوئی۔ کہ جس سے سندھ کا کونہ کونہ جگمگا اٹھا۔

21 جون سال 1955ء کی ایک شام میں نے یہ کتب خانہ بہ نفس نفیس جا کر ملاحظہ کیا۔ مرزا صاحب کے نوادرات کی زیارت کی۔ علاوہ ازیں دیگر جو چیزیں میں نے وہاں دیکھیں وہ تھیں آپ کے جمع شدہ دوستوں کے وزیٹنگ کارڈ، نایاب تصاویر کے چار عدد فوٹو البم، اخباری تراشوں کے فائل، آپ کے روزنامچے، قریباً ڈیڑھ سو اشاعت کے لیے منتظر مسودات خاص طور پر ''ابکار الافکار'' گرجی نامہ، شاہ جي رسالي جي ڪنجي، تواریخ مقدس وغیرہ وغیرہ۔

پیرحسام الدین راشدی

کتاب:ڳالهيون ڳوٺ وڻن جون

☆☆☆☆☆

جب کتب خانہ قلیچ، میں نے ان کے خاندان کے افراد کے توسط سے دیکھا۔ تو قلیچ کے بیش بہا ادبی کارناموں کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے سوچا سندھی یونیورسٹی کا نام کیوں نہ مرزا قلیچ بیگ یونیورسٹی رکھ دیا جائے۔

شیکسپیئر، ملٹن، ورڈس ورتھ، شیلی، کیٹس اور دیگر مغربی ادباء وشعراء کے منتخب شاہکار جو آپ نے سندھی زبان میں منتقل کیے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں۔

وہ اتنے بڑے آدمی تھے کہ علم وثقافت کی دنیا میں ان جیسی کسی دوسری شخصیت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ سندھ بھر کے مختلف اضلاع میں کئی عمارتوں کو قلیچ بیگ کے نام سے منسوب کیا جائے۔ اور صرف روڈ ہی نہیں، لائبریریوں، پارکوں اور باغات کو بھی آپ کے نام سے یاد کیا جائے۔

ٹیگور اپنی زندگی میں صرف ایک بار کلکتہ یونیورسٹی گئے۔ وہاں یونیورسٹی میں آج بھی ایک پتھر نصب ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے کہ گرو دیورابندر ناتھ ٹیگور نے اس جگہ پر کچھ دیر کے لیے توقف کیا تھا۔ قدر افزائی دراصل اسی جذبے کو کہا جاتا ہے۔

اے کاش سندھ میں، ہم قلیچ بیگ کے ساتھ بھی ایسا ہی حسنِ سلوک کرتے!

ڈاکٹر جی ایم مھکری

1987ء کراچی

☆☆☆☆☆

ہمیں نہایت ہی انکساری و شکر گذاری کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ قلیچ بیگ ہی تاریخی طور پر ہماری وہ پہلی بڑی سندھی علمی و ادبی شخصیت تھے کہ جس نے اہم اور وسیع تاریخی ذخیرہ یادگار کے طور پر اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ شخصی طور پر آپ عجز و انکساری کو پسند کرتے اور خود اعلیٰ انسانی اخلاق کے مالک تھے۔ اگرچہ مذہبی انسان تھے مگر ان کے مذہب میں تنگ دلی کا کہیں بھی گزر نہیں تھا۔

قلیچ بیگ کی میرے خیال میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ آپ نے پوری زندگی کا ریکارڈ خود اپنے ہاتھوں سے محفوظ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مرزا صاحب سے سبق حاصل کرنا اور ان کو اپنا رہبر و رہنما بنانا ہوگا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

(صدارتی خطاب سے اقتباس۔ 4 اکتوبر 1987ء)

☆☆☆☆☆
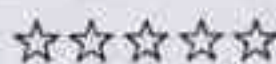
سندھی زبان و ادب کے خدمت گزار کی حیثیت سے بے شک مرزا صاحب ایک ایسی مثالی شخصیت اور کردار کے مالک تھے، کہ جن کی تقلید پر ہر سندھی قلمکار کو فخر محسوس ہونا چاہیے۔

صلح کل، انسانیت، ایمان اور اخلاق آپ کا عقیدہ تھا۔ نہ آپ کو شمس العلماء ہونے پر فخر تھا نہ اپنے اعلیٰ حسب و نسب پر غرور۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا جتنا علمی ادبی مرتبہ بڑھتا رہا آپ اتنی ہی انکساری اختیار کرتے چلے گئے۔ آپ کی انسان دوستی کا اس سے بڑا کیا ثبوت فراہم کیا جائے کہ آپ کی لکھی تمام کتابوں میں کوئی بھی ایسی کتاب نہیں ہے کہ جس میں آپ نے تنگ دلی اور نفرت کا اظہار یا پرچار کیا ہو۔

محمد ابراہیم جویو (دانشور)

☆☆☆☆☆

ہم اپنی پوری زندگی میں چارسو مضامین بھی نہ لکھ پائے ہیں مگر کتنی حیرت ومسرت کی بات ہے کہ قلیچ بیگ نے چارسو سے بھی زائد کتابیں لکھی ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب ہی انسان کے اعلیٰ اخلاق کی تربیت کرتا ہے اور قلیچ بیگ اپنے اعلیٰ اخلاق کے باعث اپنی زندگی ہی میں عام وخواص میں بڑا مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔

مرزا قلیچ بیگ علم وادب واخلاق کا ایک ایسا روشن مینار تھے۔ سندھ کی ہر نوجوان نسل آپ سے مستفیض ہوتی رہے گی۔

غلام ربانی آگرو (دانشور)

☆☆☆☆☆

قلیچ ،ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اوراس کی لغوی معنٰی ہے تلوار،مگر یہ لفظ سندھی زبان میں جب مرزا قلیچ بیگ کے حوالے سے ذہن وتصور میں ابھرتا ہے تو اپنے اصلی معنٰی کے برعکس یہ اصطلاحی معنی میں قلم و قرطاس پر لہراتا نظر آتا ہے۔ مرزا صاحب کے تصوراور فکری ارتقا کا پرتو ان کی تحریروں اور تصانیف سے صاف عیاں ہے۔ آپ بنیادی طور پر روشن خیال اور جدید فکروذہن کے مالک تھے۔ میری ادنیٰ رائے میں یہ مرزا صاحب ہی تھے کہ جن کے دم قدم سے سندھ میں خواتین میں شعورِعلم کا فروغ ہوا۔ اورخاص طور پر خواتین کے لیے الگ نصاب اورادب کا ڈول ڈالا گیا۔

اپنے پیچھے آپ نے علم وادب کا اتنا ہفت رنگ اور بے انتہا خزانہ چھوڑا ہے۔ کہ جو عرصہ دراز تک دنیائے سندھی ادب ،سندھی زبان اور سندھی قوم کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

مظہرالحق صدیقی
(وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی جامشورو)

آوازِ دوست

(معاصر دنیا کے مکتوبات، رسائل و اخبارات کے تراشوں سے اقتباسات)

یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ 1924ء سالِ نو کے آغاز میں مرزا قلیچ بیگ صاحب کو سرکار نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا ہے۔ یہ آپ کی ان بیش بہا خدمات کا صلہ ہے۔ جو آپ نے سندھی ادب کے لیے انجام دی ہیں۔ سندھ میں شاید آپ دوسرے بزرگ ہیں جنھیں اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

رسالہ صراط المستقیم

فروری 1924ء

☆☆☆☆☆

مرزا قلیچ بیگ کے آباؤ اجداد تالپورانِ سندھ کے زمانے میں گرجستان سے سندھ تشریف لائے۔ آپ نے حیدر آباد سندھ کے ہائی سکول اور بمبئ میں ایلفنسٹن کالج میں مزید تعلیم حاصل کی۔ اسکول ٹیچر کی حیثیت سے آپ نے فرائضِ منصبی کا آغاز کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ آپ کے بیش بہا ادبی وحسنِ خدمات کے عوض آپ کو قیصرِ ہند میڈل سے نوازا گیا ہے۔ اور یہ آپ کی عظیم خدمات کا حقیر سا صلہ ہے۔

سالانہ رسالہ گلدستہ کراچی 1921ء

☆☆☆☆☆

میرے پیارے مرزا قلیچ بیگ پورے طور پر ڈپٹی کلکٹر بن جانے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول ہو۔

آر جائلس

☆☆☆☆☆

پیارے قلیچ بیگ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ نے چچ نامہ اور سندھ کی تاریخ جیسے یہ کتب جو تیار کئے ہیں ہم انھیں اپنے سرکاری چھاپے خانے میں مفت چھاپ رہے ہیں۔

ایچ۔اے۔جیمس
کمشنر 17 جنوری 1898ء

☆☆☆☆☆

پیارے قلیچ بیگ: میری طرف سے سال نو مبارک

کرنل الفرید میھو
12 دسمبر 1902ء برائسن

☆☆☆☆☆

میرے پیارے قلیچ بیگ
مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو قیصرِ ہند میڈل ملا ہے۔آپ نے سندھی زبان میں عمر خیام کی رباعیات کا جو ترجمہ کیا ہے، میرے خیال میں صرف اس کتاب پر ہی آپ اس آبرو کے حقدار تھے۔
ڈبلیو۔این۔رچرڈسن
5 جنوری 1906ء کراچی

☆☆☆☆☆

پیارے قلیچ بیگ
آپ میں بڑی خداداد صلاحیتیں ہیں۔جو کام آپ نے کیے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ تم دیر تک جیو۔اگر تم قبل از وقت چلے گئے تو میرا وعدہ ہے میں آپ کی محنت کے پھل کو زمانے کے سامنے پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کروں گا۔
ڈیارام گدومل
(مرزا صاحب کے عزیز ترین دوست) 10 دسمبر 1906ء سورت

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا صاحب
پرنس فارن بائیبل سوسائٹی کی جانب سے بائیبل کا نسخہ قبول فرمائیے۔انجیل مقدس کے سندھی ترجمے کے لیے آپ نے جو مدد فرمائی اس کے لیے ہم آپ کے احسان مند رہیں گے۔
جوزف ریڈمن
یکم اپریل، شملہ

☆☆☆☆☆

مرزا صاحب

یہ جان کر آپ کو خوشی ہوگی کہ گورنر ان کاؤنسل نے آپ کو اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا ہے۔ جسے سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی نسبت میں تجاویز دینی ہیں۔

جے۔ایل۔ریو

سیکرٹری بمبئی سرکار 24 جولائی 1914ء

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا قلیچ بیگ

سندھ کرسچن لٹریچر کمیٹی کی طرف سے توریت سے کتاب پیدائش کا جو سندھی زبان میں آپ نے ترجمہ کیا ہے۔اس کام کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ٹی منسکانی

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا

اُمن سبھا کے لیے کتابیں لکھنے پر جناب کمشنر صاحب نے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے اس کام کے لیے آفرین نامہ اور ایک عدد سونے کی واچ (گھڑی) تحفتاً قبول فرمایئے۔

آر۔ایل۔ریو

کمشنر سندھ

☆☆☆☆☆

پیارے شمس العلماء

گورنر صاحب کے احکامات کی روشنی میں حال ہی میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر مبارک باد پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور خلقِ خدا کے لیے مزید کام کر دکھانے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

سی۔جی اڈم

پرائیویٹ سیکرٹری گورنمنٹ ہاؤس

بمبئی یکم جنوری 1924ء

☆☆☆☆☆

میرے پیارے مسٹر قلیچ بیگ

بیش بہا ادبی خدمات کے عوض سرکار نے آپ کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا ہے۔اس اعزاز

پانے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

ڈبلیو۔ ایف ہڈسن

کلکٹر۔ 3 جنوری 1924ء

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا قلیچ بیگ

گزیٹ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرکار نے آپ کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا ہے۔ آپ نے سندھی زبان کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اس کام کے عوض یہ بہر حال آپ کا حق تھا۔ جو آپ کو ملا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خاص اعزاز آپ کو اس سے پہلے دیگر حاصل شدہ تمام اعزازات کے مقابلے میں سب سے زیادہ پسند آیا ہوگا۔

ایس۔ ایچ کورنٹسن

کلکٹر حیدر آباد 3 جنوری 1924ء

☆☆☆☆☆

پیارے مسٹر قلیچ بیگ

شمس العلماء کا خطاب پانے پر مہربانی فرما کر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

آپ کا حامد علی

کلکٹر تھر پارکر۔ عمر کوٹ 4 جنوری 1924ء

☆☆☆☆☆

میرے پیارے مرزا صاحب

آپ کو شمس العلماء کا جو لقب ملا ہے بہر طور آپ اس کے لائق تھے۔ میں دل و جان سے یہ اعزاز پانے پر آپ کو مبارک باد پیش کر رہا ہوں۔

محمد قادر شیخ

وزیر خیر پور ریاست

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا قلیچ بیگ

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا ہے۔ یہ سند یہ اعزاز آپ جیسی شخصیت کو پہلے ہی عطا ہو جانا چاہیے تھا۔

آپ نے سندھی علم و ادب کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ سندھ میں نسل در نسل یاد رکھی

جائیں گی۔

ہوتچند مولچند گربخشانی

ڈیارام جیٹھمل سندھ کالج کراچی 4 جنوری 1924ء

☆☆☆☆☆

پیارے مرزا صاحب

شمس العلماء کا اعزاز پانے پر تمام اھلیانِ سندھ کی طرح مجھے بھی بہت دلی خوشی میسر ہوئی۔ آپ کی شخصیت میں اتنی محصوصیات اور صلاحیتیں ہیں کہ خلقِ خدا آپ سے پیار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

علامہ آئی۔ آئی قاضی

ڈسٹرکٹ جج خیرپور میرس 1924ء

☆☆☆☆☆

میرے پیارے مرزا صاحب

ابھی ابھی میں نے کراچی کے ایک روزنامے میں پڑھا ہے کہ آپ کو سرکار نے شمس العلماء کا لقب عطا کیا ہے۔ یہ پڑھتے ہی میں آپ کو مبارک باد کی یہ دو سطریں لکھنے کے سوا نہ رہ سکا۔ میں تو بڑے عرصے سے یہ امید رکھے ہوئے تھا کہ یہ اعزاز آپ کو حاصل ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میری توقع کے مطابق آپ کو یہ عزت اب حاصل ہوگئی ہے۔

آئی۔ ایچ نانسن

کلکٹر 21 فروری 1924ء سلسبری (افریقہ)

☆☆☆☆☆

قلیچ بیگ کے ترجمہ و طبع زاد اسٹیج ڈرامے

(سندھی زبان میں)

1880ء ليليٰ مجنون	اوپیرا (Opera)	ترجمہ شائع ہوا
1885ء خورشيد		ترجمہ شائع ہوا
1894ء بكاؤلي	طبع زاد	شائع ہوا
1894ء لوبي ۽ لوڪي	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کی جانب سے اسٹیج ہوا۔
1896ء شڪنتلا	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1896ء انكوائري آفيسر	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1896ء نورجهان ۽ جهانگير	طبع زاد	
1897ء نادرشاھ	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1897ء ـ حسنهہ دلدار	مرچنٹ آف وینس کا ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1897ء ـ نيم ملا خطرھ ايمان	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1897ء ـ نيم ملا خطرهجان	طبع	زادسندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1899ء ـ شيخ چلي	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1900ء ـ شاھ ايليا	کنگ لیئر کا ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1905ء ـ فيروز دل افروز	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1908ء ـ شمشاد مرجانہ	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1908ء ـ گشت جا گشت	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1909ء ـ گلزار ۽ گلنار	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1909ء ـ عزيز ۽ شريف	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1911ء ـ نيڪي ۽ بدي	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی

1911ء ۔ حرڪت ۾ برڪت	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1914ء ۔ شهزادھ	ترجمہ	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1915ء ۔ پرهيز جي تولي	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1918ء ۔ جمشيد حيمه	ترجمہ	حیدرآباد نیشنل کالج ڈرامیٹک سوسائٹی
1918ء ۔ شهريار بانو	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1918ء ۔ بدر منير ۽ بي نظير	طبع زاد	سندھ کالج ناٹک منڈلی کراچی
1924ء ۔ موهني	ترجمہ	حیدرآباد نیشنل کالج ڈرامیٹک سوسائٹی

کتب خانہ قلیچ اور باقیاتِ قلیچ

سندھی ادب میں قلیچ بیگ کا نام ان کی بے بہا ادبی خدمات کی بناء پر تا ابد زندہ رہے گا۔ ان کی 76 سالہ زندگی میں سینکڑوں کتابیں آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں اور ہزار ہا کتابیں آج بھی ان کی رہائش گاہ سے ملحقہ کتب خانے میں صحیح سلامت اور درست حالت میں نہایت سلیقے واہتمام سے محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ آپ کی وہ میز کرسی جس پر بیٹھ کر تصنیف وتالیف کا کام کرتے تھے، نیز زیرِ استعمال قلم دوات اور دیگر اشیاء بھی، سب اسی کتب خانے میں آپ کی باقیات کے طور پر محفوظ ہیں۔ آپ کا یہ کتب خانہ ٹنڈو ٹھوڑو حیدر آباد سندھ میں واقع ہے اور اب دنیائے ادب میں یہ کتب خانہ ''کتبِ خانۂ قلیچ بیگ'' کے نام سے معروف ہے۔

ملکی وغیر ملکی حکام واعلیٰ ادبی وسماجی شخصیات جو اس کتب خانے کو ملاحظہ کر چکی ہیں ان کی مختصر فہرست کچھ یوں ہے۔

علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، ہوت چند مولچند گر بخشانی، پیر حسام الدین راشدی، محمد صدیق مسافر، سائیں جی ایم سید، محمد ابراہیم جویو، ڈاکٹر غلام علی الانہ، ڈاکٹر نواز علی شوق، امداد حسینی، ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی، غلام ربانی آگرو، ڈائریکٹر خانۂ فرہنگ آغا رشید فرزانپور، مراد علی مرزا، ممتاز مرزا، مرزا عباس علی بیگ، سابقہ وزیر اعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ، ڈاکٹر فہمیدہ حسین، حمید سندھی، پروانہ بھٹی، نثار حسین وغیرہ

مذکورہ کتب خانہ اور مرزا صاحب کے باقیات 1990ء تک ان کے چوتھے بیٹے اور معروف شاعر مرزا اسد بیگ اسد کے زیر انتظام تھے۔ اب یہ فریضہ 1990ء کے بعد، مرحوم کے فرزندگان اعجاز علی بیگ مرزا اور مرزا محمد حبیب بیگ بہ حسن وخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔

کتابیاتِ قلیچ

(کتب خانۂ قلیچ کے ریکارڈ کے مطابق مرزا صاحب کی
تصنیف و تالیف و ترجمہ شدہ کتابوں کی تفصیل)

انگریزی کتابیں جن کا آپ نے سندھی زبان میں ترجمہ کیا	49
انگریزی میں لکھی کتابوں کی تعداد	41
مذہب، فلسفہ، اخلاقیات کے موضوع پر (سندھی میں)	88
ڈرامے (سندھی زبان میں)	20
ناول و قصے	23
علمی و نصابی کتابوں کی تعداد	119
خواتین کے لیے رہنما کتب	20
بچوں کا ادب (نثر و نظم)	17
شعری تخلیقات (تخلیق و ترجمہ)	29
فارسی زبان میں لکھی جانے والی کتابیں	22
عربی زبان میں	3
اردو زبان میں	5
بلوچی گرامر پر کتاب	1
کل تعداد:	457

کتب خانۂ قلیچ میں موجودہ کتابوں کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں آپ کے خطوط کے فائل اور فوٹو گرافکس کے اہم اور دیگر جمع شدہ عجائبات بھی اس کتب خانے کا بہترین سرمایہ ہیں۔ چاہیے تو یہ کہ ان کی باقیات کو بھی زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا جائے، کہ دنیا جہان فانی ہے اور مسودات جن صفحات پر درج ہیں آخر ان کی بھی زندگی انسانوں ہی کی طرح فنا پذیر ہے۔ اور اگر اب بھی اشاعت کا یہ کام نہ ہو سکا تو مسودات کو ضائع ہو جانے سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔ اور سندھی ادب بہترین ذخیرہ کتب سے محروم ہو جائے گا۔

قلیچ و شیکسپیئر

قلیچ بیگ نے نثر میں سب سے پہلے شیکسپیئر کی کتاب "Lamb's Tales" کو سندھی زبان میں منتقل کیا اور اس کتاب کا نام رکھا "دل پسند قصا" اور یہ ترجمہ 1890ء میں کیا۔ یہ کتاب دراصل شیکسپیئر کے ڈراموں کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ شیکسپیئر کا جو ڈرامہ سب سے پہلے سندھی زبان میں آپ نے ترجمہ کیا وہ تھا "Merchant of venice" آپ نے سندھی میں اس ترجمے کا نام تجویز کیا ہے "حسنہ دلدار" (1897ء) شیکسپیئر کے ڈرامے King Lear کا ترجمہ آپ نے سال 1900ء میں "شاھ ایلیا" کے نام سے کیا۔ اور یوں سال 1908ء میں شیکسپیئر کے ڈرامے "Cym beline" کا ترجمہ مرزا صاحب نے "شمشاد مرجانہ" کے نام سے تجویز کیا۔ "Two Gentlemen of verona" کے ترجمے کا نام سندھی زبان میں آپ نے تجویز کیا۔

عزیز ء شریف 1910ء اور "Romeo and Juliet" کا ترجمہ "گلزار ء گلنار" کے نام سے 1914ء آپ نے کیا اور شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے "Hamlet" کا ترجمہ "شہزادہ بھرام" کے نام سے کیا۔ سال 1918 میں مرزا صاحب نے شیکسپیئر کے جس ڈرامے کو سندھی میں منتقل کیا تھا اس کا نام رکھا "جمشید حمیدہ" اس طرح شیکسپیئر کے کم وبیش سب ڈرامے سندھی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان ڈراموں میں اکثر و بیشتر ڈرامے نہ فقط اپنے زمانے میں مختلف ڈرامیٹک سوسائٹیوں کی جانب سے اسٹیج ہوئے تھے بلکہ ان ڈراموں کو بعد میں زیورِ اشاعت سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔

کتابیاتِ قلیچ

گذشتہ صفحات میں قلیچ بیگ کی کچھ منتخب تصنیفات پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی بناء پر مرزا قلیچ بیگ کو سندھی زبان و علم و ادب کی عظیم شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان منتخب کتابوں کے علاوہ ان کی وجہ شہرت میں ان صدہا کتابوں کا عمل دخل بھی رہا ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں تصنیف یا تالیف کی ہیں۔ یہاں ان کتب کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

آپ نے یہ کتابیں سندھ کے جن جن شہروں میں ایامِ جوانی، دوران پوسٹنگ یا پینشن کے بعد لکھیں۔ ان کی تفصیل بھی درج ذیل ہے۔

1۔ 1870ء: ہار اٹاہول (بچوں کے لیے نظمیں) فارسی اور سندھی میں۔ حیدر آباد

2۔ 1872ء: جواہر اللسان۔ فارسی۔ حیدر آباد

3۔ 1874ء: پارسي جوشجرو۔ پرشین یا فارسی عروض (انگریزی میں) بمبئی

4۔ 1877ء: اشتقاق فارسی (انگریزی میں)

5۔ مقالات حکمت (انگریزی سے سندھی میں) بیکن کے مضامین کے تراجم

6۔ 1878ء قصو هرڻي جو (ہرنی کا قصہ) منظوم۔ کراچی

7۔ 1880ء: ليليٰ مجنون (منظوم ڈراما)

8۔ مومل راڻو (سندھی ڈراما)

9۔ راه نجات

10۔ هدايت النساء۔ کراچی

11۔ 1885ء: احوال شاه عبدالطيف ڀٽائي (حیاتِ شاہ لطیف) سندھی، انگریزی

12۔ ڏاڙهياري جبل جوسير (سیاحت نامہ) نصیر آباد۔ ضلع لاڑکانہ

13۔ 1887ء: لیسیرا ورس (انگریزی میں) کافیوں (کافیاں)

14۔ خورشید (سندھی ڈرامہ) نصیر آباد

15۔ 1888ء: علم اخلاق۔ صحت النساء، علم دستور المعاش، تاریخ محمدی، رستم پہلوان، مفتاح القرآن (فارسی میں) علامات القرآن۔ دلارآم (ناول)۔ نصیرآباد

16۔ 1890ء: دل پسند قصا (انگریزی سے سندھی میں) (روھڑی) زینت (پہلا سندھی طبع زاد ناول) دل پسند قصا حصہ دوئم (شکارپور) تعلیم حکمت (حصہ اول)۔ نصیر آباد

17۔ 1891: تعلیم حکمت، حصہ دوئم، سوئم، موھني (ڈرامہ) فخر الفوائی (فارسی اردو میں) نصیر آباد

18۔ 1894ء: بکاولي (ڈرامہ) لوبي ۽ نوکي (سندھی ڈرامہ)۔ اسلامي تیاسالي کیمیاء سعادت (انگریزی میں) عمرکوٹ

19۔ 1895ء: زمین پوکڻ جو علم ۽ هنر (علم کھیتی باڑی) باغ ۽ باغباني، عالم آبی، حشرات الارض۔ لاڑکانہ

20۔ 1896 نورجهان ۽ جهانگير (سندھی ڈراما) شکنتلا، نیم طبیب ء نیم ملا (سندھی ڈرامہ) جانور۔ جیکب آباد

21۔ 1897ء: نادر شاه، حسنہ دلدار، انکوائري آفيسر (سندھی ڈرامہ)، ڳوٺن جي وڏرن لاءِ هدايت (گاؤں میں رہنے والے آبادگاروں کے لیے ھدایات) شاھ عبداللطيف جو احوال (حیاتِ شاہ لطیفؒ سندھی میں) جیکب آباد

22۔ 1898ء: پکي (پرندہ) (سندھی) جیکب آباد

23۔ 1900ء: عجائب عزائب، شيخ چلي، (سندھی ڈرامہ) احوال سيد ثابت علي شاه ومرثيه (حصہ اول) فارسی زبان میں تاریخ، چچ نامہ (انگریزی ترجمہ) سوداءِ خام (سندھی اردو شاعری) حصہ اول نوشہرو فیروز

24۔ 1901ء: کیمیاء سعادت (حصہ اول ودوئم) سنڌ جي تاريخ، کوٹڑی

25۔ 1902ء: کیمیاء سعادت (حصہ سوئم) اسلامي رسالو، کوٹڑی، حیدرآباد، کراچی

26۔ 1903ء: لطيفه معرفت، کرامات الاولياء، کوٹڑی، حیدرآباد کراچی

27۔ 1904ء: سنڌ جي تاريخ تصويرن سان (تاریخ سندھ بمع تصاویر) اسلامي درجيوار چار ڪتاب، جواهر الاخلاق، تهذيب اخلاق، گلشن اخلاق، اخلاق القرآن، والحيث اخلاق النساء، اخلاق صوفيه، فرائض انساني ۽ جهان الفردوس، کوٹڑی، حیدرآباد کراچی

28۔ 1905ء: حقائق الارواح، عالم خواب، رسالو ڪريمي، لغات لطيفي، حالات اولياء رباعيات عمر خيام، فيرو دلفيروز، (ڈرامہ) سب کتابیں سندھی میں ہیں۔ حیدرآباد، کراچی

29۔ 1906ء: مقناطيس حيواني، حاجت مندي مان طاقت مندي، صداقت الاسلام، زاد الآخره،

ابکارالافکار (فارسی اردو میں) مرثیہ، ثابت علی شاہ حصہ دوئم،
عجائب الاشتقاق (انگریزی میں) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

30- 1907ء:نصحيت نامو امام غزالي،ميراث المسلمين،مجالس الشهدي،انجيل،عالم الارواح (سندھی میں) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

31- 1908ء: اسرارحكمت، رد تثليث،شمشاد مرجانه (ڈرامہ) سنڌي بولي جي تاريخ (تاریخ سندھی زبان) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

32- 1909ء:يوسف ۽ فاطمه (شاعری) عزيز وشريف (ڈرامہ) گلزار وگلنار (ڈرامہ) اشعار القرآن۔ کوٹری حیدرآباد، کراچی

33- 1910ء:سوداء خام سندھی اردو شاعری نیا ایڈیشن کوٹری، حیدرآباد، کراچی

34- 1911ء:حاجي بابا اصفحاني (سندھی ناول) نيکي بدي (ڈرامہ) حرکت ۾ برکت (ڈرامہ) سرسهڻي جي شرح، گلن جي نوکري (سندھی ناول) شرلاک هومز (ترجمہ) پرشن جيمس (انگریزی شاعری تین والیوم) حیدرآباد

35- 1912ء:ني گهر (سندھی ناول) آرزار سان آرام، علم تصوف، لطيفي لات، تعليم صحت (حصہ اول) برٽش شهنشاهت، سچو سک (سچا سکھ) تحفه النسوان، حیدرآباد

36- 1913ء:لچمي-الحيات بعد الممات، شرح سر سسئي، شاه جو رسالو (تالیف) علم ادب، طبعي الهام، جولين هوم، ايرک (سندھی ناول) حیدرآباد

37- 1914ء:اسلامي پنجون کتاب، زنوبيه، راحيل، لوسي، بابا دل، سسئي کان سواءِ ڏڙ (سرکٹا دھڑ) شمرانه، شيطان جو مريد، عجيب طلسم، عجيب الماس، سچي محبت (ناول) سنڌي شعر جي تاريخ (تاریخ سندھی شعر) چو ۽ چا (کیوں اور کیسے) موتين جي دبلي (سندھی رباعیات) حصہ اول، ايمرس جا عجيب نکته، حیدرآباد

38- 1915ء:شرح محمدي-جواني جو اکسير، چندن هار (موضوعاتی نظمیں سندھی میں) حصہ اول، سنڌ جي مختصر تاريخ (مختصر تاریخ سندھ)، علمي گلدستو، سندر ۽ وديا، امير شاه، ۽ نيڏڙا انسان (یہ ڈرامے سوسائٹی کے لیے سندھی میں لکھے گئے) حیدرآباد، کراچی

39- 1916ء:زالن جا فرض-دل جو آرام-هڪڙي سگهڙ زال (سلقیہ شعار خاتون) کادمبري، رعيت نامه، جنگ نامه، علم نحو (سندھی میں) شرح سر سریراگ (کلامِ لطیف) اسلامی تحفہ، حیدرآباد

40- 1917ء چکي خيال جي ڪرامت- مصيبت ماريا (مصیبت کے مارے) جارجيا يا

15۔ 1888ء: علم اخلاق۔صحت النساء، علم دستور المعاش، تاریخ محمدی، رستم پہلوان، مفتاح القرآن (فارسی میں) علامات القرآن۔ دلآرام (ناول)۔نصیر آباد

16۔ 1890ء: دل پسند قصا (انگریزی سے سندھی میں) (روھڑی) زینت (پہلا سندھی طبع زاد ناول) دل پسند قصا حصہ دوئم (شکارپور) تعلیم حکمت (حصہ اول)۔نصیر آباد

17۔ 1891: تعلیم حکمت، حصہ دوئم، سوئم، موھنی (ڈرامہ) فخر القوافی (فارسی اردو میں) نصیر آباد

18۔ 1894ء: بکاولي (ڈرامہ) لوہي ۽ ٹوکي (سندھی ڈرامہ)۔اسلامي ٿياسافي ڪيمياء سعادت (انگریزی میں) عمرکوٹ

19۔ 1895ء: زمين ہوکڻ جو علم ۽ هنر (علم کھیتی باڑی) باغ ۽ باغباني، عالم آبی، حشرات الارض۔لاڑکانہ

20۔ 1896 نورجھان ۽ جهانگير (سندھی ڈراما) شڪنتلا، نيم طبيب ۽ نيم ملا (سندھی ڈرامہ) جانور۔ جیکب آباد

21۔ 1897ء: نادر شاہ، حسن دلدار، انکوائري آفيسر (سندھی ڈرامہ)، ڳوٺن جي وڏرن لاء هدايت (گاؤں میں رہنے والے آبادگاروں کے لیے هدايات) شاهہ عبداللطيف جو احوال (حیاتِ شاہ لطیفؒ سندھی میں) جیکب آباد

22۔ 1898ء: پکي (پرندہ) (سندھی) جیکب آباد

23۔ 1900ء: عجائب عزائب، شيخ چلي، (سندھی ڈرامہ) احوال سيد ثابت علي شاہ و مرثيہ (حصہ اول) فارسی زبان میں تاریخ، چچ نامہ (انگریزی ترجمہ) سوداءِ خام (سندھی اردو شاعری) حصہ اول نوشہرو فیروز

24۔ 1901ء: ڪيمياء سعادت (حصہ اول و دوئم)، سند جي تاريخ، کوٹڑی

25۔ 1902ء: ڪيمياء سعادت (حصہ سوئم) اسلامي رسالو، کوٹڑی، حیدرآباد، کراچی

26۔ 1903ء: لطيفہ معرفت، ڪرامات الاولياء، کوٹڑی، حیدرآباد کراچی

27۔ 1904ء: سند جي تاريخ تصويرن سان (تاریخ سندھ بمع تصاویر) اسلامي درجيوار چار ڪتاب، جواهر الاخلاق، تهذيب اخلاق، گلشن اخلاق، اخلاق القرآن، والحيث اخلاق النساء، اخلاق صوفيہ، فرائض انساني ۽ جهان الفردوس، کوٹڑی، حیدرآباد کراچی

28۔ 1905ء: حقائق الارواح، عالم خواب، رسالو ڪريمي، لغات لطيفي، حالات اولياء رباعيات عمر خيام، فيرو دلفيروز، (ڈرامہ) سب کتابیں سندھی میں ہیں۔حیدرآباد، کراچی

29۔ 1906ء: مقناطيس حيواني، حاجت مندي مان طاقت مندي، صداقت الاسلام، زاد الآخرہ،

ابکارالافکار (فارسی اردو میں) مرثیہ، ثابت علی شاہ حصہ دوئم،
عجائب الاشقاق (انگریزی میں) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

30- 1907ء: نصحيت نامو امام غزالي، ميراث المسلمين، مجالس الشهدي، انجيل، عالم الارواح (سندھی میں) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

31- 1908ء: اسرارحکمت، رد تثليث، شمشاد مرجانه (ڈرامہ) سنڌي ٻولي جي تاريخ (تاریخ سندھی زبان) کوٹری، حیدرآباد، کراچی

32- 1909ء: يوسف ۽ فاطمه (شاعری) عزيز وشريف (ڈرامہ) گلزار وگلنار (ڈرامہ) اشعار القرآن۔ کوٹری حیدرآباد، کراچی

33- 1910ء: سوداء خام سندھی اردو شاعری نیا ایڈیشن کوٹری، حیدرآباد، کراچی

34- 1911ء: حاجي بابا اصفهاني (سندھی ناول) نيڪي بدي (ڈرامہ) حرڪت ۾ برڪت (ڈرامہ) سرسهڻي جي شرح، گلن جي نوڪري (سندھی ناول) شرلاڪ هومز (ترجمہ) برشن جيمس (انگریزی شاعری تین والیوم) حیدرآباد

35- 1912ء: ننڍي گهر (سندھی ناول) آرزار سان آرام، علم تصوف، لطيفي لات، تعليم صحت (حصہ اول)، برٽش شهنشاهت، سچوسک (سچا سکھ) تحفه النسوان، حيدرآباد

36- 1913ء: لڇمي۔الحيات بعد الممات، شرح سر سسئي، شاه جو رسالو (تالیف) علم ادب، طبعي الهام، جولين هوم، ايرڪ (سندھی ناول) حیدرآباد

37- 1914ء: اسلامي پنجون ڪتاب، زنوبيه، راحيل، لوسي، بابا دل، مسئي کان سواءِ ڏڙ (سر کٹا دھڑ) شمرانه، شيطان جو مريد، عجيب طلسم، عجيب الماس، سچي محبت (ناول) سنڌي شعر جي تاريخ (تاریخ سندھی شعر) چوءِ چا (کیوں اور کیسے) موتين جي دهلي (سندھی رباعیات) حصہ اول، ايمرس جا عجيب نڪته، حيدرآباد

38- 1915ء: شرح محمدي، جواني جو اڪسير، چندن هار (موضوعاتی نظمیں سندھی میں) حصہ اول، سنڌ جي مختصر تاريخ (مختصر تاریخ سندھ)، علمي گلدستو، سندر ۾ وديا، امير شاه، ۾ ننڍڙا انسان (یہ ڈرامے سوسائٹی کے لیے سندھی میں لکھے گئے) حیدرآباد، کراچی

39- 1916ء: زالن جا فرض۔ دل جو آرام۔ هڪڙي سگهڙ زال (سلقیہ شعار خاتون) ڪادمبري، رعيت نامه، جنگ نامه، علم نحو (سندھی میں) شرح سرسر براگ (کلامِ لطیف) اسلامی تحفہ، حیدرآباد

40- 1917ء چڪي خيال جي ڪرامت۔ مصيبت ماريا (مصیبت کے مارے) جارجيا يا

گرجستان سونهري خيال، عجيب جواهر (نظمیں) تحفه امامیه، (بیاض قلیچ) نصيب پنهنجي وس-لاله رخ (منظوم) جمشيد وحيده (ڈرامه) شڪ جو شڪار (ڈرامه) مختانقفي رواجي حڪمت، در نجف وڪشف، اعجاز يا گلشن راز (منظوم) حيدرآباد

41- 1918ء شاه جي رسالي جي ڪنجي، غلامي مان مٺي چاڙهو (ناول سندھی میں ترجمه)، پرهيز نامو، گلزار تعليمي، پاراٺا گل ڦل (بچوں کی نظمیں)، سیرت النبیؐ (حصه اول) عالم جو استاد، ڏوهن جي قبولداري، پهخط ۽ پائر ۽ پيٺون، هڪڙي انڊي شريف زال شريفه بيگم، عاقل ۽ فاطمه (تعلیم نسواں کے متعلق هدایت نامه) حيدرآباد-

42- 1919ء نصیحت نامه (مولویوں کے لیے) حيواني عقل ۽ ان جا مثال، عجيب ڳالهيون، اينڊڙ زمانو، بدايع الوقائع، انجيل، توريت، زبور، يسوع مسيح جي سوانح هندوستان جون ديسي آڪاٺيون، زنانه درجيوار ڇهه ڪتاب ۽ پاراڻي تعليم، حيدرآباد

43- 1920ء املهه ماٽڪ (مفردات) حصه اول، ورزش نامو، سليس حرف نحو، علم بديع، عروض، فوائدالاخلاق، لطائف الطوائف، مٺن سان ڪٿين ڳالهائجي، پاچين جاطعام، بيماري جاسچا ۽ ڪوڙا سبب، ملڪ جي مفلسي ۽ قرض جاسبب، زينت نسوان، مقدس ڪلام، نصيت المسلمين، اخلاق العضومين ۽ سونهري خيال حيدرآباد ڪراچي

44- 1921ء سنڌي گرامر ڊو خصائص القرآن، سنڌ جاقديم شهر ۽ انهن جامشهور ماڻهو، حيدرآباد

45- 1922ء سنڌ جي مختصر جاگرافي (سندھ کا مختصر جغرافیه) تصوف جي تاريخ شرح ديوانِ گل، اسلامي حق نامه، تقريرون تحريرون، يادگيريون (یادداشتیں)، اصلاح نامه، اصلاح نامه، هزليات (مزاحیه شاعری) شرح مومل راڻو، اسلام جا ٻهتر فرقا، رياست خيرپور جي تاريخ، تحفه اسماعيليه، اسلامي تعليم، سعادت نامو (منظوم) روشنائي نامو (منظوم) عبادت نامو، تحفته السالڪين، جهڙو خيال تهڙو حال (جیسا خیال ویسا حال) گليور جو سير ۽ سفر، رانسن ڪروسو، خانبهادر حسن علي آفندي (سوانح)، حيدرآباد

46- 1923ء شهزادو بهرام (هیملٹ کا سندھی ترجمه) اسلام موجب اصول ٽياسفي (فارسی) استادجي قلمن وٽ، چچ نامو، قديم سنڌ جاستارا، ڪريسيس، لغات قديمي، شيخ بوعلي سينا، چندن هار (موضوعاتی نظمیں حصه دوئم) املهه ماڻڪ (مفردات حصه دوئم) موتين جي دهلي (رباعیات حصه دوئم) سوداءِ خام (سندھی اردو شاعری حصه دوئم) ''سائوپن ياڪارو پنو'' (آپ بیتی)، فرهادوشيرين (منظوم ڈرامه) امام غزالي جي سوانح، حڪيم ناصر خسروعلوي جي سوانح، حيدرآباد

47- 1924ء: طب مطبوع ۽ مخزن،مثنوي ترڪيب الانسان (منظوم) شاهنمي وارا شاهه،وامق،عذرا،سائنس جا عجائب غرائب ،علم رمل، مفتاح الرمل،منهنجو عجيب گهر،خواب وتعبير- حيدرآباد

48- 1925ء: منتخب معلومات ،سڌاري جي شروعات (اصلاحات کی ابتداء) انگي حساب (تین حصوں میں) حیدرآباد

49- 1926ء: عملي مذهب،مصرنامہ،ڪامل انسان،چين ۽ چيني،شرح ديوان،قاسم ۽ فاصل، ماٺهو ڪيئن جمن ٿا- حيدرآباد

50- 1927 ء:بابل نينوا،حضرت سليمان، سچي مردانگي گلدستا،حمدوثنا،لسان الغيب، خطبا،مثنومطلع الانوار،مثنوي مخزن الاسرار،بدرمنير،و بي نظير،صلح ڪل،نمچاولن ماٺهوجو روح، فقهه جا عجيب مسئلا،ماٺهوءَمنهنجو پاڻ طبيب ،انسان جا محافظ،موت ڪانپوءِ زندگي،عالمگير مذهب- حيدرآباد

51 - 1928ء ٻڏو ۽ ڏسو،ڪافيون،دنيا جي مختصر تاريخ،ديوان قليچ باب ۽ بابي، مولانا جلال الدين رومي ،تالپرن جي صاحبي (انگریزی میں) خزینہ زرینہ (فارسی) خزینہ سیمیں (فارسی) ڪامل انسان (سندھی حصہ دوئم) زيب النساء بيگم، سلطان علائوالدين ،راڻي ۽ مٺي،پٽ چڻ ٻنهجي وس،علم موسيقي، حسن،عشق،ڇانجا ڪرشمہ(2 واليوم)حسينہ- حيدرآباد

52- 1929ء: (آپ کی زندگی میں آخری شائع شدہ کتاب تھی ''تحفته اماميه'' یہ کتاب آپ کے تحریر کردہ مرثیوں پر مشتمل ہے۔)

حرفِ آخر

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ سندھی ادب کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند کے لکھنے والوں میں نہ صرف بیسویں صدی کے عظیم ترین اور جامع الصفات ادبی شخصیت گردانے گئے ہیں بلکہ سندھی ادب کی تاریخِ ادب گواہ ہے کہ سندھی زبان کا کوئی دوسرا ادیب آپ کے ادبی قد و قامت کو آج تک نہ پہنچ سکا ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیت کے حامل مترجم و اولین ناول نگار، ڈرامہ نویس اور صاحبِ اسلوب انشا پرداز تھے۔ جدید اصناف میں بیشتر اولیت کا سہرا ان کے ہی سر تھا۔ سب سے پہلا سفرنامہ بھی انھوں نے ہی لکھا تھا۔ جدید انداز کی نظمیں بھی انھوں نے لکھنا شروع کی تھیں۔

علاوہ ازیں تعلیمی مصنف اور ادبِ اطفال کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی آپ کی ادبی خدمات کو اولین درجہ دیا جاتا ہے۔

1910ء میں آپ نے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے پینشن لی، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک آپ کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے، عبادت و ریاضت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا، آپ نہ صرف اپنی کتابیں ترجمہ و تالیف کرتے رہے بلکہ دوسرے لوگ بھی جو مواد انہیں نظر ثانی کے لیے بھیجتے تھے۔ اس کی بھی تصحیح کرتے تھے، مختلف رسائل اور مخزنوں کے لیے مضامین و شاعری اشاعت کے لیے دیتے تھے، دوست و احباب اور ادبی کتابوں کے مقدمے اور تعارف بھی آپ نے اس دوران میں خاصے لکھے، آپ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر بھی تھے، لہٰذا محکمہ تعلیم سے عربی، فارسی، اردو، سندھی کی کتابیں آپ کے پاس آراء کے لیے آتی تھیں، علاوہ ازیں مختلف محکموں کے لیے بھی آپ سے رجوع کیا جاتا تھا، ایامِ آخر میں قلیچ بیگ حیدرآباد میں تحفظِ حیوانات کی سوسائٹی کے نائب صدر بھی رہے اور اس حوالے سے کئی مضامین بھی آپ نے تحریر کیے۔

گویا تصنیف و تالیف سے قلیچ بیگ کی جو دلچسپی تھی وہ آخر دم تک قائم رہی۔ لکھنا پڑھنا اور کتابیں ترجمہ کرنا آپ کے لیے سانس لینے جیسا ناگزیر عمل تھا۔ عہدِ جوانی سے زمانۂ بزرگی تک، دفتر، سفر، گھر (اوطاق) بیٹھک، ہر جگہ تمام تر دنیاوی، گھریلو و دفتری مصروفیات سے وقت نکال کر، آپ

زندگی بھر ناول، ڈرامے، مقالات، مضامین لغت، فلسفہ، طب، تصوف، سوانح اور سائنسی موضوعات پر دنیاءِ ادب کی منتخب و بے مثل تخلیقات (نثر و نظم) کو سندھی زبان میں منتقل کرتے رہے، آپ وقت کے زیاں کو امانت میں خیانت تصور کرتے تھے، لہٰذا اپنی عمر کے آخری دنوں میں سوائے ان پانچ سات دنوں کے، جب آپ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، آپ مسلسل پڑھتے اور لکھتے رہے، تاریخِ سندھی ادب آج بھی گواہی دے رہی ہے کہ جدید سندھی نثر و نظم پر آپ کے بے حد و بے حساب احسانات ہیں اور آپ کی ان ادبی خدمات کا تذکرہ بے شک مورخین ادب آئندہ زمانوں تک آبِ زر سے لکھتے رہیں گے۔

منتخب کتابیات

سائو پن يا ڪارو پنو(1965ء)	سوانح حیات مرزا قلیچ بیگ
قربِ قليچ (1936ء)	محمد صدیق مسافر
حيات قليچ (1937ء)	مرزا ہمایوں بیگ فائق
سهه ماهي سنڌي ٻولي (1997ء)	مرزا قلیچ بیگ نمبر
ڪينجهر جنرل (1999ء)	مرزا قلیچ بیگ نمبر
سهه ماهي مهراڻ (2004ء)	مرزا قلیچ بیگ نمبر
ماهوار نئين زندگي	شمارہ ستمبر 1964ء
ماهوار نئين زندگي	شمارہ جولائی 1991ء
ڪينجهر جنرل	1993ء
ماهوار نئين زندگي	2002ء
سہ ماہی ادبیات	شمارہ 67(2002ء)